جنوری ۸۸ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
درسِ قرآن (سورۃ محمدؐ قسط ۱)	ڈاکٹر اسرار احمد	۵
اقبال کا مقام	ڈاکٹر اسرار احمد / محمد عبدالملک جامعی	۱۷
فلاسفہ کا تصورِ خدا	پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم	۲۳
منشورِ اسلام (۹)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۳۶
ربوٰ اور مضاربت میں فرق (۲)	مولانا محمد طاسین	۴۹
اراکینِ انجمن کے لیے	لطف الرحمٰن خان	۵۹
تبصرۂ کتب	ادارہ	۶۱

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کہا اقبالؔ نے شیخِ حرم سے
تہہِ محرابِ مسجد سو گیا کون!
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون؟

تہہ محراب مسجد سو جانے اور فرنگی بتکدے میں کھو جانے والوں کو بیک وقت جھنجھوڑنے اور صحافت میں ماضی قریب کی پُرعزیمت روایات کو زندہ کرنے کی ایک کوشش انشاءاللہ عنقریب.....

ہفت روزہ

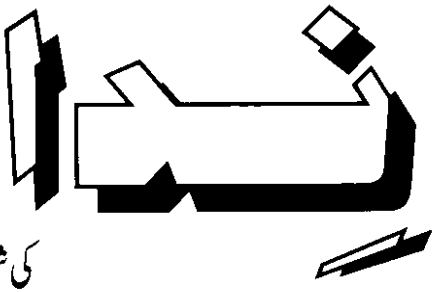

کی شکل میں منظرعام پر آئے گی۔

یکے از مطبوعات

محمد حمید احمد پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۴۱۔ اے شاہراہ پاکستان (لوئر مال) لاہور۔ ۱
فون ۸۔ ۳۲۰۱۹۶

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرة : ۲۶۹)

ماهنامه — لاهور

حکمتِ قرآن

جاری کردہ : ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ ۔ مرحوم

مدیر اعزازی : ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی ۔

معاون مدیر : حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

مینجنگ ایڈیٹر : اقتدار احمد

جلد ۷ — جنوری ۱۹۸۸ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ — شمارہ ۱

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاهور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاهور ۱۴۔ فون: ۸۵۲۶۱۱

کراچی آفس : ۱۱ داؤد منزل متصل شادی بیگم، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون -/۴۰ روپے فی شمارہ ۔ ۴ روپے

مطبع : آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاهور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

اس شمارے سے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کے مضامین و مقالات کی ترتیب وار اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ پروفیسر صاحب مرحوم کی ذات حکمتِ قرآن کے اکثر قارئین کے لیے محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ مرکزی انجمن اور انجمن کے صدر مؤسس سے مرحوم کا جو تعلق رہا ہے اس کا یہ مظہر تو سب پر عیاں ہے کہ ۱۹۸۳ء تک[1] انجمن کے زیر اہتمام قرآن کانفرنسوں اور قرآنی محاضرات کی ایک نشست کے مہمانِ مقرر ہمیشہ وہی ہوتے تھے اور پیرانہ سالی اور ضعفِ جسمانی کے باوصف اپنی کھنکھتی ہوئی مضبوط آواز اور اپنے جوشِ جذبات سے محفل کو گرما دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نشست سب سے زیادہ بھرپور ہوتی تھی جس سے اُنہیں خطاب کرنا ہوتا تھا۔

چشتی صاحب مرحوم کی زندگی بعض اعتبارات سے بہت بھرپور اور ہمہ جہت تھی۔ جوانی کا پُرجوش دور انہوں نے تحریکِ پاکستان کے ایک انتہائی سرگرم کارکن اور شعلہ بیان خطیب کے طور پر گزارا۔ اُن کا شمار بانیٔ پاکستان کے قریبی رفقاء میں ہوتا تھا۔ مسلسل چودہ برس تک علامہ اقبال مرحوم کی خدمت میں حاضری دینے کی سعادت انہیں حاصل ہوئی۔ چنانچہ اقبال کی تمام کتابوں کی عام فہم شرح لکھ کر اقبال کے افکارِ عالیہ کو متوسط صلاحیت کے لوگوں تک پہنچانے کی سعادت بھی انہی کے حصّہ میں آئی۔ تاریخ اور فلسفہ تاریخ، مذہب اور فلسفۂ مذہب، فلسفہ اور فلسفۂ تاریخ اور ادیانِ عالم اور ان کا تقابلی مطالعہ ان کی خصوصی دلچسپی کے مضامین تھے۔ انہیں مطالعے کا شوق ہی نہیں ذوق حاصل تھا۔ اور اس سب پر مستزاد یہ کہ تصوف سے بھی انہیں خصوصی شغف تھا۔ چنانچہ اس کوچے کی گشت نوردی کا شرف بھی انہیں حاصل تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں محققانہ اور ناقدانہ نگاہ بھی رکھتے تھے۔ اِس میدان میں اُن کی ضخیم کتاب "تاریخ تصوف" ایک بہترین علمی اثاثہ ہے۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ساتھ چشتی صاحب مرحوم کے مشفقانہ تعلق کا جو رشتہ ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر صاحب کی لاہور آمد کے ساتھ ہی استوار ہو گیا تھا وہ مرحوم کے دمِ آخر تک قائم رہا۔ مرحوم ایک صاحب طرز انشاء پرداز بھی تھے۔ عمر کے آخری چند سالوں میں انہوں نے لکھنا ترک

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب ۳ فروری ۸۴ء کو رحلت فرما گئے تھے۔

کر دیا تھا لیکن جب تک اُن کا قلم چلتا رہا 'میثاق' کے ساتھ ان کا تعلق قائم رہا۔ اور ان کے رشحاتِ قلم قارئین کی ضیافت طبع اور استفادۂ علمی کا ذریعہ بنتے رہے۔ لیکن 'حکمت قرآن' نے چونکہ اپنے سفر کا آغاز ہی ۱۹۸۲ء سے کیا تھا لہٰذا قارئینِ حکمت قرآن کو ان کی قیمتی تحریروں سے استفادے کا موقع نہیں مل سکا۔ چنانچہ حکمت قرآن کی ساتویں جلد کے آغاز سے ہم افاداتِ سلیم چشتی کے عنوان سے مرحوم کے مقالات و مضامین کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ مرحوم کے بعض وہ مقالات بھی شائع کیے جائیں گے جو ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۰ء کے دوران 'میثاق' میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس وقت تک چونکہ 'میثاق' کا حلقہ تعارف نہایت مختصر تھا لہٰذا اُن کی افادیت کا دائرہ بھی بہت محدود رہا۔

اس شمارے میں چشتی صاحب مرحوم کا جو مضمون شائع کیا جا رہا ہے اس کا پس منظر یہ ہے کہ مولانا عبدالحق صاحب خیر آبادی کے جانشین حکیم برکات احمد ٹونکی نے اپنے دادا استاذ مولانا فضل حق خیر آبادی کے رسالے 'روض المجود' کی شرح فارسی زبان میں لکھی تھی جس کی ایک نقل ۱۹۵۱ء میں چشتی صاحب مرحوم نے ایک قلمی نسخے سے حاصل کی۔ چشتی صاحب کو چونکہ 'فلسفۂ وجود' سے خصوصی دلچسپی تھی لہٰذا انہوں نے نہایت عرق ریزی سے 'روض المجود' کا اردو ترجمہ کیا۔ 'روض المجود' کے دیباچے میں حکیم برکات احمد ٹونکی کے قلم سے ایک جملہ نکل گیا کہ "میں اپنی جوانی کے زمانے میں حکماء کی پیش کردہ توحید میں سرشار رہا"۔ بس اسی پر جو تحریک ہوئی تو چشتی صاحب مرحوم نے اس پر ایک نوٹ لکھنا شروع کیا جو بجائے خود ایک علمی مقالہ بن گیا جو "فلاسفہ کے تصورِ خدا" کے عنوان سے شاملِ اشاعت ہے۔

●●●

اسلام کی انقلابی قدروں کا علمبردار

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر: ڈاکٹر اسرار احمد

خود پڑھیے اور دوسروں کو پڑھائیے

فی شمارہ پانچ روپے — سالانہ زرِ تعاون ۵۰ روپے

قرآنی بک اسٹال سے حاصل کریں یا ہم سے طلب فرمائیں

مکتبہ تنظیم اسلامی — ۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون نمبر۔ ۸۵۲۶۱۱

فہمِ قرآن

اور

خصوصاً قرآن کے منضبط اور مربُوط مطالعہ کے ضمن میں —

ڈاکٹر اسرار احمد

کی نشری (ریڈیو) تقاریر پر مبنی ایک اہم تصنیف

قرآن مجید کی سُورتوں کا اجمالی تجزیہّ

(سورہ الفاتحہ تا سورہ الکہف)

ضرور مطالعہ کیجیے

◎

اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ کتابت ○ دیدہ زیب طباعت

ہدیہ : ۱۲ روپے

درسِ قرآن

(۱۰)

ڈاکٹر اسرار احمد

سورۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ترتیب و تسوید: جمیل الرحمٰن / عاکف سعید

گزشتہ سے پیوستہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّ اللّٰہَ یُدۡخِلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ؕ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یَتَمَتَّعُوۡنَ وَ یَاۡکُلُوۡنَ کَمَا تَاۡکُلُ الۡاَنۡعَامُ وَ النَّارُ مَثۡوًی لَّہُمۡ ۝ وَ کَاَیِّنۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ ہِیَ اَشَدُّ قُوَّۃً مِّنۡ قَرۡیَتِکَ الَّتِیۡۤ اَخۡرَجَتۡکَ ۚ اَہۡلَکۡنٰہُمۡ فَلَا نَاصِرَ لَہُمۡ ۝ اَفَمَنۡ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ کَمَنۡ زُیِّنَ لَہٗ سُوۡٓءُ عَمَلِہٖ وَ اتَّبَعُوۡۤا اَہۡوَآءَہُمۡ ۝ مَثَلُ الۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ وُعِدَ الۡمُتَّقُوۡنَ ؕ فِیۡہَاۤ اَنۡہٰرٌ مِّنۡ مَّآءٍ غَیۡرِ اٰسِنٍ ۚ وَ اَنۡہٰرٌ مِّنۡ لَّبَنٍ لَّمۡ یَتَغَیَّرۡ طَعۡمُہٗ ۚ وَ اَنۡہٰرٌ مِّنۡ خَمۡرٍ لَّذَّۃٍ لِّلشّٰرِبِیۡنَ ۚ وَ اَنۡہٰرٌ مِّنۡ عَسَلٍ مُّصَفًّی ؕ وَ لَہُمۡ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ مَغۡفِرَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ ؕ کَمَنۡ ہُوَ خَالِدٌ فِی النَّارِ وَ سُقُوۡا مَآءً حَمِیۡمًا فَقَطَّعَ اَمۡعَآءَہُمۡ ۝ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّسۡتَمِعُ اِلَیۡکَ ۚ حَتّٰۤی اِذَا خَرَجُوۡا مِنۡ عِنۡدِکَ قَالُوۡا لِلَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ وَ اتَّبَعُوۡۤا اَہۡوَآءَہُمۡ ۝ وَ الَّذِیۡنَ اہۡتَدَوۡا زَادَہُمۡ ہُدًی وَّ اٰتٰىہُمۡ تَقۡوٰىہُمۡ ۝ فَہَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا السَّاعَۃَ اَنۡ تَاۡتِیَہُمۡ بَغۡتَۃً ۚ فَقَدۡ جَآءَ اَشۡرَاطُہَا ۚ فَاَنّٰی لَہُمۡ اِذَا جَآءَتۡہُمۡ ذِکۡرٰىہُمۡ ۝ فَاعۡلَمۡ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِکَ وَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ مُتَقَلَّبَکُمۡ وَ مَثۡوٰىکُمۡ ۝ وَ یَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَوۡ لَا نُزِّلَتۡ سُوۡرَۃٌ ۚ فَاِذَاۤ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَۃٌ مُّحۡکَمَۃٌ وَّ ذُکِرَ

فِيهَا الْقِتَالُ ۙ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۖ فَأَوْلَىٰ لَهُمْ ۝ طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ ۚ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ ۚ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۝ فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِن تَوَلَّيْتُمْ أَن تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ ۝

اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید سے ہم سورۂ محمدؐ کے پہلے رکوع کا مطالعہ مکمل کر چکے ہیں۔ سورۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے رکوع میں وہ عمومی مضامین زیر بحث آئے ہیں جو قرآن حکیم کی مکی سورتوں میں نہایت تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں۔ لہٰذا یہاں ہم ان کا ترجمہ اور ان کا مفہوم اجمالاً سمجھ لینے پر اکتفا کریں گے۔

آگے بڑھنے سے قبل، تمہیدی طور پر، اسلوب قرآنی سے متعلق مزید ایک بات نوٹ کر لیجئے اور وہ یہ کہ قرآن میں کسی اہم حقیقت کو اجاگر کرنے اور نکھارنے کے لئے فوری تقابل (SIMULTANEOUS CONTRAST) کا اسلوب کثرت سے ملتا ہے۔ اگر اہل جنت کا ذکر آتا ہے تو فوراً اہل جہنم کا نقشہ بھی دکھا دیا جاتا ہے، مفلحین کا اگر کہیں ذکر آتا ہے تو ساتھ ہی خاسرین کا تذکرہ بھی کر دیا جاتا ہے۔ سورۂ محمدؐ میں یہ اسلوب بہت نمایاں ہے۔

پہلے رکوع میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ پہلی دو آیات کے مضمون پر غور کیجئے، اسلوب نمایاں انداز میں موجود ہے۔ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ "وہ لوگ جنہوں نے خود بھی کفر کی روش اختیار کی اور اللہ کے راستے سے خود بھی رکے اور دوسروں کو بھی روکنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، اللہ نے ان کی ساری بھاگ دوڑ اکارت کر دی، ان کی تمام تدبیریں ناکام کر دیں" ..... اور .....

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝ ..... "ان کے مقابلہ میں وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، جنہوں نے نیک اعمال کئے، ایمان کے تقاضوں کو عملاً پورا کیا اور اس چیز پر ایمان لائے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی، اور وہی حق ہے ان کے رب کی طرف سے، ان کا معاملہ یہ ہے کہ اللہ نے ان سے ان کی خامیوں کو، کوتاہیوں کو، لغزشوں کو، خطاؤں کو دور کر دیا اور ان کے تمام احوال درست فرما دیئے"۔ دوسرے رکوع میں یہ

تقابل خاص طور پر آخرت کے حوالے سے آیا ہے..... اس تمہیدی گفتگو کے بعد ہم اللہ کے نام سے مطالعہ شروع کرتے ہیں۔

آخرت کے دو مختلف انجام

فرمایا اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ "یقیناً اللہ تعالیٰ داخل فرمائے گا ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے ان باغات میں جن کے دامن میں نہریں بہتی ہیں۔" پچھلی نشستوں میں میں اس کی تشریح کر چکا ہوں کہ خاص طور پر مکی سورتوں میں اور پھر ابتدائی مدنیات میں جن میں سے میرے خیال میں 'یہ سورۂ مبارکہ اغلباً دوسری سورہ ہے' 'اعمال صالحہ' سے کون سے اعمال مراد ہوتے ہیں!..... ابھی شریعت کے تفصیلی احکام تو آئے ہی نہیں تھے۔ زکوٰۃ کا پورا نظام ابھی نازل ہی نہیں ہوا' حج کے دروازے ابھی بند ہیں۔ صلوٰۃ پنج گانہ کا پورا نظام ہجرت کے کچھ عرصہ پہلے اور کچھ ہجرت کے بعد آیا ہے' اسے کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اعمال صالحہ کے جو تصورات ہمارے ذہنوں میں بیٹھے ہوئے ہیں' درحقیقت وہ اس پس منظر میں موزوں (FIT) نہیں بیٹھتے۔ وہ اعمال صالحہ کیا ہیں جن کا ذکر تمام مکیات میں بکثرت وباعادہ آیا ہے اور اس سورت میں بھی آیا ہے؟..... یہ قابل توجہ بات ہے..... اس تناظر میں بات واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ ان مکیات میں دراصل 'اعمال صالحہ' سے مراد ہے دعوت وتبلیغ کرنا' صبر وثبات کا مظاہرہ کرنا' توحید پر جمے رہنا' کسی بھی دباؤ میں نہ آنا حالات کی کسی بھی ناموافقت سے بددل نہ ہونا' اپنے موقف پر ڈٹے رہنا۔ صلوٰۃ کا جو ابتدائی نظام آ چکا ہے اس کی پابندی اور محافظت کرنا' امانت اور عہد کی پاسداری کرنا' عصمت وعفت کی حفاظت کرنا۔ یہ ہوگی اس وقت 'اعمال صالحہ' کی تشریح وتوضیح..... جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں..... جوں جوں احکام شریعت نازل ہوئے تو لن کی بجا آوری' ان کی پابندی بھی 'اعمال صالحہ' کے ذیل میں آتی گئی اور اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ اعمال صالحہ کا دائرہ پوری شریعت کو محیط ہو گیا۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ جس مقام اور جس تناظر میں یہ لفظ قرآن مجید میں آتا ہے اس کا مفہوم اسی پس منظر میں اچھی طرح سمجھیں۔

یہاں فرمایا جارہا ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے یقیناً اللہ تعالیٰ انہیں داخل کرے گا ان باغات میں جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گیں' یعنی دامن میں ندیاں رواں ہوں گی ۔ اب یہاں فوری تقابل کے طور پر اہل کفر کا انجام بھی دکھا دیا گیا' فرمایا وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ "اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور حظ حاصل کر رہے ہیں" ۔ تمتع کے معنی ہیں' فائدہ اٹھانا۔ یعنی اہل کفر دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں' فائدہ اٹھا رہے ہیں اس کی نعمتوں اور لذتوں سے شاد کام ہو رہے ہیں..... وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ" اور وہ بھی اسی طرح کھا پی رہے ہیں' جیسے حیوانات چر چگ رہے ہیں"..... ذرا تصور کیجئے کہ زمین پر اللہ تعالیٰ کی کس قدر اور کتنی مخلوق آباد ہے! اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لئے کوئی نہ کوئی غذا فراہم کی ہوئی ہے اور ہر ایک اپنا رزق پا رہا ہے۔ لہٰذا یہ کافر بھی کھا پی رہے ہیں جیسے اور جانور کھا پی رہے ہیں..... یعنی اس دنیا میں کفار و مشرکین کی فراغت' آسائش اور ساز و سامان کی کثرت سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے..... اس معاملہ میں اصل قابل غور بات یہ ہے کہ انجام کار کے اعتبار سے کامیاب کون ہو گا! ۔ جنت کی ابدی نعمتوں سے تمتع کرنے کا حق دار کون ہو گا! یہ کفار و مشرکین اس دنیا کی نعمتوں سے تمتع کر رہے ہیں تو کریں۔ آخرت میں جس انجام سے انہیں سابقہ پیش آئے گا وہ بہت خوفناک ہے۔ فرمایا وَالنَّارُ مَثْوًی لَّهُمْ ○ "اور آگ ان کا (آخری) ٹھکانا ہو گی"

اُمم سابقہ سے عبرت

آگے چلئے' فرمایا وَکَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ هِیَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْیَتِکَ الَّتِیْ اَخْرَجَتْکَ "اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کتنی ہی بستیاں ایسی گذر چکی ہیں جو بہت قوی اور' بہت زور آور تھیں' اس بستی سے کہ جس بستی (کے لوگوں) نے آپؐ کو نکال دیا" اگرچہ یہاں اخرجتک میں نسبت قریہ کی طرف ہے یعنی جس بستی نے آپ کو نکال دیا یعنی اصل میں یہاں ظرف سے مراد مظروف ہے۔ یعنی جس قریہ والوں نے آپؐ کو نکال دیا۔ آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو تکلیفیں پہنچائیں' اذیتیں دیں' حتی کہ آپؐ کے خون تک کے پیاسے ہو گئے اور آپؐ کو اس بستی سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا

تو اس بستی سے کہیں قوی اور زور آور بستیاں پہلے بھی گذر چکی ہیں..... اشارہ ہے قومِ عاد، قومِ ثمود، اصحابِ مدین وغیرہ کی بستیوں کی طرف، جن سے اہلِ مکہ خوب واقف تھے..... جن کے مقابلے میں مکہ والوں کی کوئی حیثیت تھی ہی نہیں۔ وہ تو کعبۃُ اللہ کی وجہ سے عرب میں مکہ کو تقدس کا مقام حاصل تھا ورنہ قوت و شوکت کے لحاظ سے سابقہ قوموں کے مقابلہ میں قریش کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ لیکن ان قوموں کا انجام یہ ہوا کہ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ○ "ہم نے ان سب کو ہلاک کیا پس ان کے لئے کوئی مددگار نہیں ہے"..... جو لوگ عربی گرامر سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ یہاں نوٹ کریں کہ اگر کوئی بات جملہ فعلیہ کی شکل میں آتی ہے تو اس میں ماضی حال اور مستقبل کا کوئی نہ کوئی زمانہ متعین ہو جاتا ہے۔ لیکن جب تک جملہ اسمیہ کی شکل میں آتی ہے تو اس میں کسی مخصوص زمانے کا حوالہ نہیں ہوتا بلکہ دوام ہوتا ہے، گویا وہ ایک آفاقی بات ہوتی ہے۔ ایک عالمی قانون ہوتا ہے، جس میں کوئی استثناء نہیں ہوتا..... تو یہاں "فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ" ایک کلیہ کا فائدہ دے رہا ہے۔ یعنی یہ کہ جس طرح اس موقع پر جب ان قوموں، پر عذاب آیا تھا تو کوئی ان کا مددگار نہ بن سکا اور ان کو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی نہ تھا اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ اسی طرح جب ان بستیوں والوں کو جہنم میں جھونکا جائے گا تو اس وقت ان کا کوئی مددگار نہیں ہو گا..... درحقیقت اس آیت میں مشرکین مکہ پر ایک نوع کی تعریض ہے کہ یہ کس اکڑ میں ہیں! کس گھمنڈ میں ہیں! بڑی بڑی قوی قومیں تباہ کر دی گئیں، بڑی بڑی تہذیبیں ملیامیٹ کر دی گئیں، بڑے بڑے شہر کھنڈر بنا دیئے گئے تو ان قوموں کے مقابلہ میں ان مشرکین مکہ کی حیثیت کیا ہے! اللہ کی پکڑ جب آئے گی تو ان کے لئے دم مارنے کی مجال تک نہ ہو گی۔

فوری تقابل کی ایک اور مثال

آگے چلئے۔ اب آپ کو اکثر آیات میں یہی فوری تقابل کا اسلوب ملے گا، فرمایا اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ○ "کیا یہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص، جو انسان اپنے رب کی طرف سے ایک روشن طریقے پر ہو اس شخص کی مانند ہو جائے جس کے لئے اس کے عمل کی برائی مزین کر دی گئی ہے اور جو اپنی خواہشات نفس کے پیچھے چلنے والے ہیں۔ "بَيِّنَة" سے مراد ہے "ایک

نہایت تابناک اور روشن حقیقت" جسے اپنے وجود پر کسی خارجی دلیل کی حاجت نہ ہو۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ "بَیِّنَۃ' وہ چیز ہے جو آفتاب کی مانند اپنی دلیل آپ ہے۔

بیّنہ کا قرآنی مفہوم

اس آیت میں" عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّہٖ" کے الفاظ پر توجہ کیجئے۔ سورۂ ہود میں متعدد انبیاء ورسل کے ذکر میں یہ الفاظ اسی ترتیب سے بتکرار وارد ہوئے ہیں۔ یہاں درحقیقت بینہ سے مراد ہے انسان کی فطرت سلیم اور فطرت صالح جو اپنی اصل پر قائم ہو' جو غلط ماحول یا غلط تربیت کے زیر اثر مسخ (PERVERTED) نہ ہو گئی ہو جس میں حق کو پہچاننے اور قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ فطرت اگر سلامت ہو تو انسان کو حق کو پہچاننے میں دیر نہیں لگتی اور جیسے ہی انکشاف حق ہوتا ہے انسان لپک کر حق کو قبول کرتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قبول اسلام اس کی زندہ مثال ہے۔ اس کے برعکس اگر فطرت مسخ ہو جائے تو انسان اپنی بد اعمالیوں کے لئے عقلی توجیہات کرتا ہے' عقلی دلیلیں دیتا ہے۔ بے حیائی کے کاموں کو ثقافت اور کلچر کا نام دے کر انہیں خود بھی اختیار کرتا ہے اور ان کو ترویج بھی دیتا ہے۔ اس لئے کہ بے حیائی کے کاموں کو اگر بے حیائی کا نام دے کر کیا جائے گا تو کچھ لوگ جن کا ضمیر ابھی زندہ ہے' اس کی مذمت کریں گے' اس پر احتجاج کریں گے چنانچہ ثقافت کے نام سے جو کچھ ہو رہا ہے' اس پر وہ اب بھی تنقیدیں کرتے ہیں' لیکن وہ مؤثر اس لئے نہیں ہوتیں کہ اسے کلچر' تہذیب' آرٹ اور ثقافت کے خوشنما ناموں کے لبادے اڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ جیسے خدا ناآشنا جمہوریت کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم نے اپنی مشہور نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں خود ابلیس کی زبان سے کہلوایا ہے ؎

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

تو لوگوں نے آج' بے حیائی کے کاموں کو روشن خیالی اور کلچر' تہذیب' آرٹ' ثقافت کے ناموں کے لبادے اڑھا رکھے ہیں۔

تزئینِ عملِ سوء

یہ اور اسی نوع کے دوسرے بے شمار برے کام ہیں جن کو یہاں " زُیِّنَ لَهٗ سُوْءُ عَمَلِهٖ " کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی عمل کی برائی کو خوش نما بنا دینا' مزین کر دینا۔ اس پر خوشنما ودل آویز پردے ڈال دینا۔ خوش نما اصطلاحات کے لبادوں میں اس عمل کی برائی کو چھپالینا۔ اس کی جو بدنمائی ہے اس کو خوش نما نقابوں کے ذریعہ سے نگاہوں سے مخفی کر دینا..... تو جن لوگوں کا وطیرہ یہ ہو تو در حقیقت یہ تمام صورت حال اور کیفیات نتیجہ ہیں اس امر واقعی کا کہ ان کی فطرت سلیمہ وصحیحہ مسخ ہو چکی ہے اور ان کے پیش نظر ہوائے نفس کے سوا اور کوئی اعلیٰ قدر ہے ہی نہیں۔ اسی لئے فرمایا وَ اتَّبَعُوْا اَهْوَاءَ هُمْ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی خواہشات نفس کی پیروی میں لگے ہوئے ہیں۔

اس آیت کا اسلوب سوالیہ واستفہامیہ ہے۔ یہ وہ ہی اسلوب ہے جو سورۂ قلم میں اختیار کیا گیا کہ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَ ○ مَا لَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ ○ "کیا ہم اپنے فرمانبرداروں کا انجام مجرموں جیسا کریں گے؟ تمہیں کیا ہو گیا؟ تم کیسا حکم لگاتے ہو؟"..... پس یہاں فرمایا کہ کیا وہ لوگ جو اپنی فطرت سلیمہ پر قائم ہیں' بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کا انجام ان لوگوں کے مانند ہو جن کے لئے ان کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہو اور وہ لوگ اپنی خواہشات نفس کے پیرو کار بنے ہوئے ہوں.....

لفظ فطرت سے میرا ذہن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کی طرف منتقل ہوا کہ کل مولود یولد علی الفطرة حتی یعوب عنه لسانه فابواه یهودانه او ینصرانه او یمجسانه (طبرانی) نسل انسانی کا ہر بچہ فطرت سلیمہ لے کر دنیا میں تولد ہوتا ہے۔ اس کے والدین یہودی' نصرانی' مجوسی یا کسی اور مذہب کے پیرو کار ہوں گے تو وہ اپنے بچہ کو اسی پر اٹھائیں گے..... غلط ماحول' غلط تربیت' غلط تعلیم اس بچہ کی فطرت سلیم پر حجابات اور اثرات ڈال دیتی ہیں۔ چنانچہ بچہ فطرتِ سلیمہ اور عقل صحیحہ سے کام لینے کی صلاحیت سے محروم رہ جاتا ہے اور بالآخر اسکی فطرت مسخ اور عقل خبط ہو جاتی ہے۔ الا ماشاء اللہ.....

الفاظ کے استعمال میں احتیاط

یہاں یہ بات خصوصیت کے ساتھ نوٹ کیجئے کہ بعض اوقات ہم چند الفاظ کا استعمال بہت غیر محتاط طور پر کر دیتے ہیں۔ ایک لفظ ہے جبلّت جسے فارسی میں سرشت کہتے ہیں۔ اسی مفہوم میں خلقت کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن ایک لفظ ہے فطرت..... جس کا مفہوم بالکل جدا ہے۔ فطرت کا لفظ ہمیشہ خیر کی اور مدح کی جگہ پر استعمال ہوتا ہے۔ جب شر کی بات آئے گی تو اسے فطرت سے منسوب نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ یوں کہیں گے کہ یہ جبلی کمزوری ہے یا فلاں برائی انسان کی سرشت میں داخل ہے یا خلقت کا جزو ہے۔ لیکن شر کی بات کو کبھی بھی فطرت سے تعبیر نہ کیجئے۔ فطرت کے لفظ کا اطلاق ہمیشہ خیر اور مدح کے کام پر ہو گا۔ فطرت درحقیقت انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی عطیہ ہے۔ سورۃ الروم میں فرمایا" فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا" انسان کی تو یہ شان ہے' یہاں فطرت کا لفظ اللہ تعالیٰ نے مقام مدح میں فرمایا.....

جنّت کی نعمتوں کا بیان

آگے چلئے' آپ دیکھیں گے کہ یہاں پھر فوری تقابل کے طور پر اہل جنت اور اہل جہنم کا ذکر ایک دوسرے اسلوب سے آرہا ہے۔ فرمایا مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ "صفت اُس جنت کی جو وعدہ کی گئی ہے متقیوں سے" ۔ یعنی وہ جنت کہ جس کا وعدہ متقین سے کیا گیا ہے..... وہ جنت کیسی ہے! فرمایا" فِیْهَا اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ" اس میں دریا ہیں' نہریں ہیں' ندیاں ہیں' ایسے ٹھہرے ہوئے پانی کی نہریں کہ جن کے نہ مزے میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے اور نہ اس میں کوئی بو پیدا ہوتی ہے..... ہمارے یہاں دریا' نہر' ندی کے پانی کے متعلق یہ بات عام طور پر پائی جاتی ہے کہ اس کے مزے میں کچھ کڑواہٹ بھی ہوتی ہے۔ جن راستوں سے دریا گذر کر آیا ہے اس گذرگاہ میں جو معدنیات (MINERALS) ہوتی ہیں' ان کا ذائقہ اور بو پانی میں شامل ہوتی رہتی ہے۔ پانی کی رنگت بھی بدلتی ہے۔ لیکن جنت کی نہروں کے متعلق فرمایا فِیْهَا اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ جنت کی نہروں کی کیفیت یہ ہو گی کہ ان میں صاف شفاف اور ٹھہرا ہوا پانی بہہ رہا ہو گا..... میں آج غور کر تا رہا تھا

تو مجھے دنیا میں قریب ترین اس کی یہ مثال سمجھ میں آئی ہے کہ پہاڑوں میں جو نالے ہوتے ہیں ان کا پانی اتنا صاف و شفاف ہوتا ہے کہ تہہ نظر آ رہی ہوتی ہے۔ تو ان سے ہزاروں گنا صاف و شفاف پانی جنت کی نہروں کا ہو گا۔ آگے فرمایا وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ..... اور ایسے دودھ کی نہریں بہہ رہی ہوں گی جن کا ذائقہ بدلا ہوا نہیں ہو گا..... یعنی نہ دودھ پھٹے گا اور نہ اس میں کوئی اور خرابی پیدا ہو گی..... نوٹ کر لیجئے کہ آج کل عربی میں 'لبن' کا لفظ عام طور پر دہی کے لئے استعمال ہوتا ہے اور دودھ کے لئے وہاں اب جو لفظ مستعمل ہے وہ حلیب ہے۔ لیکن قدیم عربی میں یہ لفظ دودھ کے لئے بولا جاتا تھا..... ابھی جنت کی نہروں کا ذکر چل رہا ہے چنانچہ آگے فرمایا وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ "اور وہاں شراب کی ایسی نہریں جاری ہوں گی کہ یہ مشروب پینے والوں کے لئے نہایت لذیذ ہو گا"..... یعنی جنت کی شراب کی کیفیت دنیا کی شراب جیسی نہیں ہو گی کہ جس میں نہایت کڑواہٹ اور تلخی ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ دنیا کی شراب کے نشہ اور خمار سے انسان کے ہوش و حواس جاتے رہتے ہیں۔ لیکن جنت کی شراب کے متعلق قرآن میں متعدد مقامات پر کہا گیا ہے کہ جنت کی شراب میں سرور تو ہو گا لیکن ایسا ہرگز نہیں ہو گا کہ انسان اس کو پی کر عقل و خرد سے بیگانہ ہو جائے اور نہ ہی اس میں تلخی ہو گی بلکہ وہ پینے والوں کے لئے نہایت لذیذ ہو گی..... آگے فرمایا وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى "اور اس جنت میں صاف شفاف شہد کی نہریں بہتی ہوں گی"..... یعنی اس شہد میں نہ کسی قسم کی آمیزش ہو گی اور نہ بساند ہو گی بلکہ وہ شہد بالکل صاف و شفاف ہو گا.....

حدیث میں جنّت کی نہروں کا بیان

جنت کی نہروں کی کیفیات کی ایک حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے پیارے انداز میں تشریح فرمائی ہے اور یہ مرفوع حدیث ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جنت کا دودھ مویشیوں کے تھنوں سے نکلا ہوا نہیں ہو گا"..... ہم جس دودھ سے واقف ہیں وہ تو جانوروں کے تھنوں سے نکلا ہوا ہوتا ہے لیکن حضورؐ کے ارشاد گرامی کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ جنت کا دودھ کوئی شے دگر ہو گا' اس کو ہمارے ذہن سے قریب تر لانے کے لئے دودھ کا لفظ قرآن مجید میں استعمال فرمایا گیا ہے..... حدیث شریف میں آگے

ذکر آتا ہے کہ "وہاں کا شہد مکھیوں کے پیٹ سے نکلا ہوا نہ ہو گا..... اور وہاں کی شراب کو لوگوں نے اپنے قدموں سے روند کر نہ بنایا ہو گا" ..... یہ آخری حصہ جو شراب سے متعلق ہے، بڑا اہم ہے..... زمانہ قدیم میں انگور اور کھجور کو پہلے پیروں سے روند کر ان کا عرق نکالا جاتا تھا پھر شراب بنانے کے لئے اس شیرے کو سڑایا جاتا اور پھر مختلف مراحل سے گذارا جاتا تھا..... ہمارے اس دور میں بھی کھانے کی بعض چیزیں جو بڑی لذیذ ہوتی ہیں ان کے متعلق اگر لوگوں کو پتہ چل جائے کہ وہ کس طور پر اور کس مرحلہ سے گذر کر وجود میں آتی ہیں تو شاید ہی کوئی اسے کھانے پر آمادہ ہو..... مشہور ہے کہ ریوڑیاں بنانے کے لئے اس کا جو قوام تیار کیا جاتا ہے تو اس کے لوازمات کو پہلے خوب پیروں سے روندا جاتا ہے جس میں کاری گروں کے پیروں کا میل اور پسینہ بھی لازماً شامل ہوتا ہو گا۔ پھر وہ اس قابل بنتا ہے کہ اس سے ریوڑیاں بنائی جائیں..... اسی طریقے سے ہمارے یہاں درمیانی درجے کی بیکریوں میں ڈبل روٹی اور بسکٹ بنانے کے لئے آٹا یا میدہ بھی بڑی بڑی ناندوں میں ڈال کر پیروں کے ذریعہ سے گوندا جاتا ہے۔ پھر سویوں میں تار بنانے کے لئے لوچ جس چیز سے پیدا ہوتا ہے وہ چیز چھیچھڑوں سے تیار ہوتی ہے..... اسی کو ہم جیلاٹین کے نام سے جانتے ہیں اب تو ہمارے یہاں حرام و حلال کی تمیز بھی اٹھتی چلی جارہی ہے لہٰذا اللہ جانے کہ کتنے لوگ مردار اور حرام جانوروں کی کھالوں کے چھیچھڑے بھی جیلاٹین بنانے کے لئے استعمال کرتے ہوں گے..... جہاں تک شراب کا معاملہ ہے تو اس دور میں اس کی تیاری کے لئے بڑے بڑے پلانٹ لگ گئے ہیں۔ لیکن وہاں بھی کشید کردہ عرق کو سڑانے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور استعمال ہوتا ہو گا..... لیکن جنت کی شراب انتہائی پاکیزہ ہو گی ان تمام خرافات سے مبرا ہو گی۔ اس دنیا میں انسان کو پھل اور میوے بڑے مرغوب ہوتے ہیں لہٰذا آگے فرمایا

وَلَهُمْ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ "اور اہل جنت کے لئے وہاں ہر قسم کے پھل اور میوے ہوں گے" ..... اس سے پہلے تو مشروبات کی بات چل رہی تھی۔ دودھ، شہد، شراب یہ سب مشروبات ہیں۔ اب کھانے کی چیزوں میں مرغوب ترین چیز کا ذکر فرمادیا گیا کہ اس جنت میں ہر نوع کے پھل اور میوے ہوں گے..... اس دنیا میں بعض پھل اور میوے موسموں اور علاقوں سے متعلق ہوتے ہیں لیکن جنت کے پھل اور میوے اس قید سے بالکل مستثنیٰ ہوں

گے۔ مزید یہ کہ یہ پھل اور میوے بھی دنیا کے پھل اور میووں سے متشابہ تو ہوں گے لیکن یہ بھی مشروبات کی طرح اعلیٰ ترین لذت فرحت کے اعتبار سے بڑے مختلف ہوں گے۔ جن کا کوئی حتمی اور قطعی تصور اس دنیا میں ممکن نہیں ہے۔

مغفرت کی بشارت

یہاں تک تو جنت کی نعمتوں کا ذکر ہوا۔ آگے اس بات کا ذکر ہے جس کی ایک بندۂ مومن کو سب سے زیادہ احتیاج ہے۔ جس کے بغیر وہ جنت کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ ہے مغفرت..... لہٰذا یہاں مومنین صادقین کو اس کی بشارت بایں الفاظ دی جارہی ہے وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ۔ ''اور ان کے لئے ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے' بخشش ہے'' ان کی خطاؤں' ان کی لغزشوں ان کی کوتاہیوں' ان کے گناہوں کی معافی اور پردہ پوشی کی نوید بھی سنادی گئی جو ایک بندۂ مومن کا اصل مقصود و مطلوب ہے..... مغفرت کا صحیح مفہوم دراصل پردہ پوشی ہے۔ اس لئے کہ '' غفر '' کا لفظ بنیادی طور پر کسی چیز کو چھپانے کے مفہوم میں آتا ہے۔ مغفر کہتے ہیں خود کو۔ پچھلے زمانہ میں جنگ میں سر کو تلوار کے وار سے بچانے کے لئے لوہے کے خود استعمال ہوتے تھے۔ آج کل اس خود نے ہلمٹ (HELMET) کی شکل اختیار کر لی ہے۔ معافی' بخشش اور درگذر دراصل مغفرت کے مجازی مفاہیم و معانی ہیں..... لہٰذا یہ ہے عظیم ترین بشارت مومنین صادقین اور مجاہدین فی سبیل اللہ کے لئے کہ ان کی خطاؤں کی اللہ تعالیٰ قیامت کے روز پردہ پوشی فرمائے گا۔

اہل جہنم سے تقابل

ابھی آیت ختم نہیں ہوئی۔ آگے فرمایا كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ یہاں ابتداء میں حذف کا اسلوب ہے جو بہت اہم ہے۔ یہاں مفسرین نے یہ الفاظ محذوف مانے ہیں أَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهِ النَّعِيمِ'' کیا وہ شخص جس کے حصہ میں جنت کی یہ نعمتیں آنے والی ہیں'' ..... وہ ان لوگوں کے برابر ہو جائے گا جو ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ ان کو ایسا کھولتا ہوا گرم پانی پلایا جائے گا جو

ان کی آنتوں اور انتڑیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا..... یہاں قطّع آیا ہے جو باب تفعیل ہے۔ اس کے معنی ہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ فَقَطَّعَ اَمۡعَآءَ هُمۡ ۔ یعنی انہیں جو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا وہ انتڑیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا ۔ واضح رہے کہ از روئے قرآن مجید و احادیث شریف اس طرح چھٹکارا نہیں مل جائے گا بلکہ وہ آنتیں پھر درست کر دی جائیں گی اور کھولتا ہوا پانی ان کے پھر ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا اور یہ عمل ہمیشہ ہمیش جاری رہے گا۔ اس عذاب کو دوام ہے۔ عذاب جہنم سے دوزخیوں کے نظام جسمانی میں سے جو چیز، جو عضو ختم یا مختل ہو گا، اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ پیدا فرما دے گا اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ سورۃ النساء میں تصریح موجود ہے "كُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُهُمۡ بَدَّلۡنٰهُمۡ جُلُوۡدًا غَيۡرَهَا" جیسے جیسے ان کی کھالیں جھلس کر ختم ہو جاتی جائیں گی ویسے ویسے ہم انہیں دوسری کھالیں دیتے رہیں گے"۔ تاکہ جہنم کی آگ کی جلن اور سوزش قائم و پیہم رہے۔ دیکھئے تقابل کا اسلوب یہاں بھی موجود ہے۔ جنت کی نعمتوں کے ذکر کے معاً بعد جہنم کے عذاب کی جھلک بھی دکھا دی گئی۔ اس طرح پوری بحث بالکل منقّح ہو کر سامنے آ گئی۔

(جاری ہے)

ڈاکٹر اسرار احمد

نے اپنی دوسری دینی اور علمی خدمات کیساتھ ساتھ شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں

ایک اصلاحی تحریک

بھی برپا کی اور ــــ خطبۂ نکاح ــــ کو صرف ایک رسم

کی بجائے واقعی تذکیر و نصیحت اور معاشرتی زندگی سے متعلق اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کا ذریعہ بنایا

اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی ایک اہم تحریر اور ایک خطبۂ نکاح کو دیدہ زیب کتاب کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔

بڑے سائز کے ۴۸ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور،

ہدیہ: ۴ روپے ــــــــ محصول ڈاک علاوہ

مولانا عبدالملک جامعی
ڈاکٹر اسرار احمد

علاّمہ اقبال کا مقام

اواخر دسمبر ۸۷ء میں متحدہ عرب امارات اور انگلستان کے لگ بھگ سوا ماہ کے سفر سے واپس آیا اور اپنی غیر موجودگی میں موصول شدہ ڈاک کا جائزہ لیا تو ایک مضمون نما تحریر مولانا عبدالملک جامعی مقیم مدینہ منورہ کی بھی دیکھنے میں آئی، جس میں انہوں نے علامہ اقبال مرحوم کے بارے میں اپنے تاثراتِ قلبی کا اظہار بھی کیا ہے اور ان کے ساتھ اپنی ایک عالم رویاء کی ملاقات کا حال بھی بیان کیا ہے..... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علامہ مرحوم کے بارے میں مولانا محمد الیاسؒ بانی تحریک تبلیغ کا ایک قول بھی نقل کیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی پاکستان، بالخصوص لاہور کی فضا میں اس ناخوشگوار بحث کی تلخی بھی گھلی ہوئی محسوس ہوئی جو ناروے میں سردار عبدالقیوم خاں، صدر آزاد جموں و کشمیر کی تقریر اور اس پر ردعمل سے پیدا ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک شدید قسم کے شش و پنج کا معاملہ پیدا ہو گیا کہ اگر اس تحریر کو شائع کرتا ہوں تو اندیشہ ہے کہ اسے اس بحث و تمحیص اور رد و قدح کے سلسلہ میں نہ شمار کر لیا جائے جو اس وقت بعض سیاسی اور دیگر اسباب کی بناء پر تلخ سے تلخ تر ہوتا جا رہا ہے..... اور شائع نہیں کرتا تو دل ملامت کرتا ہے کہ اللہ کے ایک نیک بندے نے جو چالیس سال سے زائد عرصہ سے جوارِ نبیؐ میں مقیم ہے ایک امانت لوگوں تک پہنچانے میں جو مدد چاہی ہے اس سے انکار بڑی دناءت اور محرومی ہے۔

بہت سوچ بچار کے بعد موخر الذکر احساس غالب آیا۔ جس کے نتیجے میں یہ تحریر بغرضِ اشاعت دے رہا ہوں۔

مولانا محمد عبدالملک جامعی سے میرا پہلا غائبانہ تعارف ۱۹۷۷ء میں ہوا تھا جب ان کا ایک خط میرے نام مدینہ منورہ سے موصول ہوا جس میں انہوں نے مجھے اپنی ایک تحریر پر مبارکباد دی تھی جو دسمبر ۷۶ء کے 'میثاق' میں شائع ہوئی تھی اور جس میں میں نے برصغیر پاک وہند میں تحریک رجوع الی القرآن کی تاریخ بیان کرتے ہوئے انیس ویں صدی کے اواخر اور بیس ویں صدی کے اوائل میں شائع شدہ تراجم وتفاسیر قرآن کا جائزہ اور ان کے ضمن میں اپنی رائے پیش کی تھی..... ساتھ ہی انہوں نے مجھے یہ اطلاع بھی دی تھی کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ نے 'میثاق' کا وہ پرچہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کو جوان دنوں کسی مؤتمر میں شرکت کے لئے وہاں مقیم تھے میری اس تحریر کو پڑھنے کی تاکید مگر "واپسی کی شرط" کے ساتھ دیا تھا..... اسی خط سے معلوم ہوا کہ مولانا جامعی اگست ۱۹۴۷ء میں دہلی سے براہ راست مدینہ منورہ ہی ہجرت کر گئے تھے اور تب سے وہیں جوار نبیؐ میں مقیم ہیں اور مدینہ منورہ کے محکمہ مدارس القرآن میں مراتب ومفتش کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اور اس کے علاوہ ذاتی حیثیت میں 'محمد علی اکادمی' اور 'بزم اردو' کے عنوان سے علمی وادبی سرگرمیوں کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد مراد آباد (بھارت) کے مولانا افتخار احمد فریدی صاحب سے ربط وتعلق قائم ہوا تو مولانا جامعی کے بعض محامد ومحاسن کا علم ہوا..... مولانا فریدی انہیں عاشق قرآن قرار دیتے ہیں اور اسی بناء پر انہوں نے کئی بار پرزور مشورہ دیا کہ مولانا جامعی کو لاہور میں منعقد ہونے والی قرآن کانفرنس میں ضرور شرکت کی دعوت دی جائے، لیکن افسوس کہ تاحال اس کی نوبت نہ آسکی..... اس عرصہ میں صرف ایک بار ان سے ملاقات کا موقع بھی ملا لیکن کچھ میرے پاس وقت کی کمی اور کچھ ان کی مصروفیات کے باعث زیادہ گفتگو نہ ہوسکی۔ ویسے بھی میں نے انہیں نہایت کم گو اور کم از کم اس وقت ایک قسم کے جذب ہی کی کیفیت میں پایا تھا۔ اگر اللہ نے چاہا تو اس سال مارچ ۸۸ء میں منعقد ہونے والی قرآن کانفرنس کے لئے انہیں لاہور تشریف لانے کی زحمت دی جائے گی۔

مولانا جامعی کی حسب ذیل تحریر اگرچہ ہمارے دفتر میں ۱۵ر دسمبر ۸۷ء کو موصول ہوئی تھی تاہم اس کے اختتام پر مولانا نے اپنے قلم سے تاریخ ۸/۴/۱۴۰۸ درج کی ہے یعنی ۸ر ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ جو ہمارے حساب سے لگ بھگ ۲۹ر نومبر ۸۷ء بنتی ہے۔ اور جہاں

تک مجھے معلوم ہے اس وقت تک اوسلو (ناروے) والی تلخ بحث (CONTROVERCY) ——— کا کوئی ذکر اخبارات میں نہیں آیا تھا۔ گویا مولانا کی اس تحریر کا کم از کم بظاہر احوال کوئی تعلق اس بحث سے نہیں ہے..... (اگرچہ اس عالم خلق سے ماوراء عالم امر میں کسی واقعے یا معاملے کا فیصلہ کس حکمت سے ہوتا ہے یہ ہمارے علم و بحث سے باہر ہے!)

اس تعارفی تمہید کے بعد مولانا جامعی کی تحریر ملاحظہ ہو!

اسرار احمد عفی عنہ

حکیم الاُمّت اقبال ——— ایک خواب

رمضان شریف اور اس سے پہلے بھی ڈاکٹر صاحب (یعنی علامہ اقبالؒ) مطالعہ میں تھے۔ خیال آیا ڈاکٹر صاحب کی اصل تعلیمات کیا ہیں' ایسی جن پر عمل کیا جا سکے۔ ایک خاکہ تیار کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کو خواب میں دیکھا' میں شاید کسی مسجد میں معتکف ہوں اس لئے کہیں جا نہیں سکتا' ڈاکٹر صاحب کو تکلیف دی' خود تشریف لائے' میں نے وہ خاکہ سامنے رکھا' میرا خیال ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا' مگر فرمایا کہ بھائی ہمارے استاد یا مرشد نے دس باتوں میں امتحان لیا' تین میں ہم پاس ہوئے..... یہ تینوں میں نے نوٹ کر رکھی تھیں مگر چھ ماہ سے بیمار ہوں' سارے کاغذات سے بے خبر ہوں' صرف ایک بات یاد رہ گئی "کسی سے بغض و عناد نہ ہو"..... بات ختم ہو گئی' اٹھ کر چلے' میں مشائعت کے لئے دروازہ تک آیا۔ پیدل جا رہے تھے' میں نے عرض کیا سواری موجود ہے۔ فرمایا نہیں' ایسے ہی ٹھیک ہے۔ میں نے اس وقت لباس پر خاص طور پر نظر کی۔ بیداری کے بعد میں نے غور کیا کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کو اس لباس میں پہلے کبھی دیکھا ہے' مگر بہت یاد کرتا ہوں یاد نہیں آتا' ساری ملاقاتوں اور زیارتوں کو سامنے لایا مگر یہ لباس کہیں نظر نہیں آیا۔ میری بڑی بچی کے بچے جدہ سے آئے ہوئے تھے۔ وہ ایک دن میرے کمرے میں گھس گئے اور میری ساری کتابوں کو تہہ و بالا کر دیا' میں آیا' تو بہت غصہ آیا مگر اس شر میں ایک خیر نظر آئی کہ قرطبہ کی وہ نظم جو ایک زمانہ میں حکومت نے عربی ترجمہ کے ساتھ شائع کی تھی وہ ہاتھ آ گئی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کی تصویر بھی ہے اور وہی اسی لباس میں جس میں انہوں نے مسجد قرطبہ میں نماز پڑھی

تھی، اور یہی وہ لباس تھا جس کو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ اس کی تعبیر میں نے یہ لی کہ مجھے قرطبہ والی نظم سے خاص تعلق ہونا چاہئے۔ یہ بھی قدرتی اتفاق کہ مجھے اسی زمانہ میں وہ قطعہ بھی مل گیا جو عید کارڈ کے طور پر ۱۹۳۶ء میں اپنے دوستوں کو تقسیم کیا تھا۔ اسی مسجد قرطبہ والی نظم کا ایک حصہ تھا

"ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ"۔ اس کا مطلب بھی یہ لیا کہ مجھے اس "شان مومن" کو اپنے اور دوسروں کے اندر پیدا کرنا چاہئے۔ میں نے اس زمانہ میں اس کو شائع بھی خوب کیا۔ [1] یہاں مدینہ پاک میں تعلیمات کا جو خاکہ بنایا تھا، اس میں کئی چیزیں تھیں لیکن جو سب سے زیادہ مجھ پر اثر انداز ہوئی وہ ہے "اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِّنَ الْیَدِ السُّفْلٰی"۔ مسلمان کا ہاتھ ہر دم اور ہر جگہ "اَلْعُلْیَا" ہونا چاہئے، وہ کہیں "اَلسُّفْلٰی" نہ ہو۔ وہ دینے کے لئے پیدا ہوا ہے، لینے کے لئے نہیں، انفرادی ہو یا قومی۔ اس کی قوم کو ایسا ہونا چاہئے کہ وہ دنیا کو دے، وہ امریکہ اور روس سے لینے والا نہ ہو بلکہ ان کو دینے والا ہو۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہر آدمی میں علیا کی عزت اور عظمت پیدا ہو جائے۔ اگر ایک آدمی علیا کی حقیقت کو جان لے تو پھر کہاں کی رشوت، کہاں کی بے ایمانی اور کہاں کی چوری چکاری۔ جو آدمی اپنے ہاتھ کو علیا رکھنا چاہتا ہے وہ کیسے رشوت لے سکتا ہے، رشوت میں تو دینے والے کا علیا ہو گا اور اس کا سفلی۔ میرے نزدیک تو یہ ہماری ساری بیماریوں کا علاج ہے۔

دوسری چیز "سوال سے پرہیز"۔ حتی الامکان کسی سے سوال نہ کیا جائے۔ عزتِ نفس کے خلاف ہے اور یہ بھی اَلْیَدُ الْعُلْیَا کی ایک شاخ ہے۔ اور یہ دونوں تفسیر ہیں اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ○ کی۔

یہ مرقومہ جو کئی دن میں مکمل ہو سکا (بوجہ علالت)، مگر یہ تاخیر ایک نئی توجیہہ کا باعث ہوئی، یعنی یہ ڈاکٹر صاحب کا ایک طریقہ تعلیم تھا۔ گویا انہوں نے میرے لائحہ عمل کے بارے

---

[1] محترم جامعی صاحب نے علامہ مرحوم کی جو نظم اپنے دستخط کے ساتھ بڑی تعداد میں طبع کرا کے ہدیۃً لوگوں میں تقسیم کی تھی صفحہ ۲۲ پر شائع کی جا رہی ہے۔ اس پر تاریخ ۱۲ر محرم الحرام ۱۴۰۷ھ درج ہے۔

میں تو فرمایا "ٹھیک ہے، کوئی مضائقہ نہیں، اس کو کر سکتے ہو کرو" مگر اصل بات یہ ہے کہ "دل سے بغض و حسد کو دور کرو"۔ واقعہ ہے کہ یہ میری سب سے بڑی بیماری ہے، مجھ سے زیادہ شاید دنیا میں کسی میں بھی اس درجہ میں نہیں پائی جاتی۔ صوفی غلام محمد مرحوم (مدینہ منورہ کے جواہرات میں سے تھے) فرماتے تھے کہ یہ باطنی کوڑھ ہے۔ اس بیماری کی کوئی دوا نہیں، لاعلاج ہے۔ میرا حال یہ ہے کہ لوگوں کی ترقی سے ناخوش ہوتا ہوں اور ان کے نقصان سے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ صاف صاف لکھ دیا، شاید کسی کی دعا کارگر ہو جائے۔

مولانا الیاسؒ اور اقبال

مولوی ظہیر الحسن، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے ایم اے کے ساتھی اور مولانا الیاس کے بہت قریبی عزیز (ان کی بیوی کے بھائی) انہوں نے مجھ سے خود بیان کیا کہ مولانا ایک دن میرے کمرے میں آئے اور فرمایا "مولوی ظہیر، مولوی ظہیر، مجھے اقبالؒ کی سب کتابیں جمع کر کے دے، مجھے ان سے اصول اخذ کرنے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کا جب انتقال ہوا، مولانا کی مجلس میں ذکر آیا، لوگوں نے اعتراضاً کچھ گستاخی کی۔ مولانا نے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور خاموشی کا اشارہ کیا۔ مجلس سب مولانا مدنیؒ (کے عقیدت مندوں) کی تھی۔ انہیں کب صبر آتا، انہوں نے وہ قطعہ یاد دلایا کہ اس نے تو حضرت مدنیؒ کو ایسا ایسا کہا ہے۔ مولانا نے فرمایا "اسے حق تھا، وہ صاحب مقام شخص تھا۔"

کاندھلہ کا یہ مکان مولانا کی ننھیال کا مکان ہے۔ تاریخی بات یہ ہے کہ یہی ایک مکان ہے ہندوستان میں جہاں سرسید اور مولانا قاسم یک جا ہوا کرتے تھے۔ سرسید اس خاندان کے شاگردوں میں ہیں۔

محمد عبدالملک عبدالقیوم

ص۔ ب..... ۲۷۴ المدینۃ المنورۃ

۱۴۰۸/۴/۸ھ

شانِ مومن

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کار ساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمئ محفل ہے وہ

اقبال

ہدیہ
منجانب الحقیر محمد [illegible]
ص ب 272
المدینة المنورة
١٢/١/١٤٠٧

فلاسفہ کا تصوّرِ خدا

حکما اور فلاسفۂ عالم نے افلاطون اور ارسطو سے لے کر الیگزینڈر اور وہایٹ ہیڈ تک ذات باری کے جو تصورات پیش کئے ہیں وہ ناقص اور موردِ اعتراضاتِ عقلیہ ہی نہیں ہیں بلکہ باہمد گر مختلف بھی ہیں۔ ہر فلسفی نے اپنے پیش رووں یا ہمعصروں کی تغلیط کی ہے اور اپنا نظریہ بڑے وثوق اور جزم کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور اس اختلاف کثیر کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فلسفہ الٰہیات کا طالب علم حیران اور ششدر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس مختصر حاشیے میں اس حقیقت کی وضاحت ناممکن ہے' اگر ایسا کروں تو یہ حاشیہ ایک مستقل کتاب بن جائے گا۔ مختصراً عرض کرتا ہوں کہ پورے ۶۵ سال تک الٰہیات کا مطالعہ کرنے کے بعد علیٰ وجہ البصیرت' اکبرالہ آبادی مرحوم کا ھمنوا ہو کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

اکثر فلاسفہ کے پیش کردہ تصورات کا مطالعہ کرنے کے بعد دل یہ بات کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایسے ناقص' عاجز اور محدود اور مضطر خدا کو تسلیم کرنے سے تو اس کا انکار کرنا زیادہ قرین عقل ہے۔

لیکن میرے قیاس کی رو سے حضرت مصنف مرحوم کی مراد جن حکماء سے ہے وہ ارسطو اور اس کے شارحین یا مقلدین ہیں' کیونکہ درس نظامیہ میں بالعموم ارسطو اور اس کے شارحین ہی کا فلسفہ داخل نصاب ہے۔

ڈیکارٹ' مالی برانش' اسپنوزا' لائبنز' لاک' برکلے' کانٹ' فختے' اور ہیگل'

شیلنگ اور ان کے متبعین کا فلسفہ متداول نہیں ہے۔ اور اہل علم سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی کے یورپین خدا پرست حکما کانٹ اور ہیگل انہی دونوں کے شاگرد یا خوشہ چیں ہیں جس طرح ازمنہ وسطی تک تمام حکماء افلاطون اور ارسطو کے متبع تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ یورپ کا فلسفہ الٰہیات بقول وہائٹ ہیڈ ' فلسفہ افلاطون کی شرح ہے۔

اس لئے میں اس حاشیئے میں صرف ارسطو کی الٰہیات کا خلاصہ درج کئے دیتا ہوں تاکہ ناظرین پر مصنف مرحوم کے اس قول کی صداقت واضح ہو جائے کہ حکماء کے فلسفے میں ظلمت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

تمہید

ارسطو کی تمام تصانیف میں اس کی "مابعد الطبیعات" کو گل سرسبد کا مرتبہ حاصل ہے۔ اگر اس کتاب کی خصوصیات بیان کرنے لگوں تو یہ حاشیہ بجائے خود ایک کتاب بن جائے گا۔ اس لئے صرف اس بات پر اکتفا کرتا ہوں کہ اس کتاب میں چودہ ابواب ہیں اور بارہویں باب میں ارسطو نے الٰہیات سے بحث کی ہے۔ اس باب میں دس فصلیں ہیں' اور آخری پانچ فصلوں میں ذاتِ واجب اور اس کے تضمنات پر اپنے افکار پیش کئے ہیں۔

اس باب میں ارسطو کی فلسفیانہ فکر اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ دو ہزار سال سے حکمائے عالم اس باب کی شروع لکھ رہے ہیں۔ مسلمان اور عیسائی متکلمین نے یہی اس کی مابعد الطبیعات اور خصوصاً باب دوازدہم پر اپنی توجہ مبذول کی ہے جن میں علامہ ابن رشد کا نام سرفہرست ہے۔ علامہ موصوف کی شرح مابعد الطبیعات سے عیسائیوں کے سب سے بڑے متکلم طاس ایکوئناس نے معتدبہ فیض حاصل کیا۔ اس نے اپنی مشہور تالیف "الٰہیات" میں علامہ موصوف کا نام لئے بغیر ان کی طویل عبارتیں نقل کی ہیں۔ ملا باقر واماد' ملا صدرا' اور ملا ہادی سبزواری' سب نے ابن رشد ہی کے خوان علم سے ریزہ چینی کی ہے۔

فلسفے کے بنیادی اور مشہور ترین مذاہب تین ہیں۔ باقی تمام مذاہب انہی کی ترقی یافتہ یا ترمیم شدہ صورتیں ہیں۔

۱..... مادیت۔ (MATERIALISM) اس کا نمائندہ اور ناظم دیمقراطیس ہے' اس فلسفے کی رو سے مادہ 'اصل کائنات وحیات ہے۔ روح اسی کی اعلیٰ صورت ہے۔ بذات خود اس کی کوئی اصلیت یا حقیقت نہیں ہے۔

۲..... تصوریت (IDEALISM) اس کا نمائندہ اور مدوّن افلاطون ہے۔ اس فلسفے کی رو سے' روح مجرد (تصوّر) اصل حیات و کائنات ہے۔ مادہ اسی کی ادنیٰ صورت ہے بذات خود اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ تصوّرات (مثل افلاطون) اصل حقائق ممکنات ہیں اور ممکنات انہی IDEAS کے عکوس واظلال ہیں۔

۳..... خارجیّت۔ (REALISM) اس کا نمائندہ اور مرتب ارسطو ہے۔ اس فلسفے کی رو سے روح اور مادہ دونوں حقیقی ہیں' موجود فی الخارج ہیں اور اصل حیات و کائنات ہیں۔

یہ تینوں فلسفے تین ہزار سال سے آپس میں برسرپیکار ہیں اور ہر دور میں ان فلسفوں نے نئے ناموں اور نئے لباسوں کے ساتھ جلوہ دکھایا ہے اور ظاہر پرستوں کو اپنا دیوانہ بنایا ہے۔

یہ تینوں فلسفے آریائی ذہانت و فطانت کی پیداوار ہیں۔ اربابِ علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ جب آریوں نے اپنے وطن کو خیرباد کہا تو اس قافلے کا ایک حصہ ایران ہوتا ہوا یونان میں سکونت پذیر ہوا۔ اور دوسرا حصہ درہ خیبر کو عبور کر کے شمالی ہندوستان میں وارد ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی اور یونانی فلسفے میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے اور کوئی شخص اس صداقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ منطق 'فلسفہ اور الٰہیات میں ساری دنیا ان آریوں ہی کی شاگرد ہے۔

آمدم برسرِ مطلب'

مذکورہ بالا تصریحات سے علمی دنیا میں ارسطو کے مقام کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ دنیا کا کوئی فلسفہ نہ تو ناظورۂ حقیقت کو بے نقاب کر سکا ہے اور نہ بنیادی مسائل کا تسلی بخش حل پیش کر سکا ہے۔ اسی لئے لسان الغیب حافظ شیرازی نے ہمیں متنبہ فرما دیا ہے۔

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو
کہ کش نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

ترجمان حقیقت اکبرالہ آبادی نے اسی نکتہ عالیہ کو یوں بیان کیا ہے۔

انکشاف راز ہستی عقل کی حد میں نہیں
فلسفی یاں کیا کرے اور سارا عالم کیا کرے

حافظ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی حکمت (عقل) کی مدد سے "رازِ دہر" کو دریافت نہیں کر سکتا اور اکبر کہتے ہیں کہ "رازِ ہستی" کا انکشاف، عقل کی دسترس سے باہر ہے۔ دونوں نے ایک ہی بات کہی ہے، کیونکہ رازِ دہر اور رازِ ہستی دراصل ایک ہی معتبر کی دو تعبیریں ہیں۔ ایک نے اسے دہر سے تعبیر کیا دوسرے نے ہستی سے۔ خوب غور کر کے دیکھ لو! نہ کائنات سمجھ میں آتی ہے نہ ہستی کا کچھ سراغ ملتا ہے۔

مازِ آغاز و زِانجامِ جہاں بے خبریم
اول و آخرِ ایں کہنہ کتاب افتاد است

پورے ۵۸ سال تک فلسفیانہ مسائل میں غور و فکر کیا لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ آج بھی وہیں ہوں جہاں ۱۹۱۴ء میں تھا۔ دنیا جہان کا فلسفہ پڑھ لینے کے بعد بھی نہ کسی سوال کا جواب دے سکتا ہوں نہ کسی مسئلے کو حل کر سکتا ہوں۔ اور اپنی حقیقت نہ اس وقت معلوم تھی نہ آج معلوم ہے۔ خیر و شر اور جبر و اختیار کی گتھی نہ اس وقت سلجھا سکتا تھا نہ آج سلجھا سکتا ہوں۔ مجھ پر کیا موقوف ہے عصر حاضر کے سب سے بڑے علمبردار تصوریت مطلقہ رادھا کرشن نے بھی نارسائی فہم کا اعتراف کیا ہے۔

اسی لئے مجبور ہو کر اقبال کی اس نصیحت پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔

بچشمِ عشق نگر تا سراغ او یابی
جہاں بچشمِ خرد سیمیا و نیرنگ است

اس تمہید کے بعد اب ارسطو کے تصوّرِ ذاتِ باری کا خلاصہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ انسانی عقل کس قدر عاجز اور درماندہ ہے۔

اسی لئے تو اقبال نے یہ کہا ہے۔

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات

اثباتِ واجب

ارسطو نے ذاتِ واجب پر جو دلیل مرتب کی ہے اسے ہم جدید اصطلاح میں دلیلِ آفاقی کہتے ہیں۔ یہ دلیل مابعد الطبیعات کے باب دوازدہم سے ماخذ ہے اس نے ذاتِ واجب پر حرکت سے استدلال کیا ہے۔

۱..... اشیاء کائنات کی اصل جواہر ہیں۔ چونکہ تمام جواہر معرض فنا میں ہیں اس لئے تمام اشیاء فانی ہیں۔

۲..... لیکن دو چیزیں غیر فانی ہیں (کیونکہ وہ غیر ممکن التولید ہیں) اور یہ دو چیزیں تغیّر اور زمان ہیں۔ زمان اس لئے غیر فانی ہے کہ اس سے قطع نظر کر کے قبلیت اور بعدیت کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا۔ اور تغیّر، زمان کے ساتھ مسلسل ہے۔

۳..... مسلسل تغیّر دراصل صرف تغیّر مکانی ہے اور مسلسل تغیر مکانی صرف حرکت مستدیرہ کا ہے اس لئے ایک ازلی مستدیرہ کا وجود عقلاً ضروری ہے۔

۴..... ازلی حرکت کے صدور کے لئے۔

(ا) ایک ازلی (ذاتِ واجب) کا وجود لازمی اور ضروری ہے۔

(ب) اس میں ایک ایسی اصل کا ہونا ضروری ہے جو حرکت کی علت بن سکے۔

(ج) اس ازلی جوہر میں صرف یہ قدرت کافی نہیں ہے بلکہ اسے اس قدرت کو فعل میں بھی لانا چاہئے۔

(د) اس جوہر ازلی کا ذاتی تقاضا قدرت نہیں بلکہ فعلیت ہونا چاہئے کیونکہ اگر فعلیت اس کی ذات کا اقتضا نہ ہو تو یہ ممکن ہے کہ کسی وقت وہ اس قدرت پر عامل نہ ہو اور اس صورت میں حرکت ازلی نہ ہوگی۔

۵..... کوئی ذات ایسی ہے جو افلاک کو حرکت دے رہی ہے لیکن جو (ذات) محرک ہے مگر خود بھی متحرک ہے وہ کسی دوسرے محرک کی محتاج ہے۔ اور اگر وہ محرک بھی متحرک ہے تو اس کے لئے دوسرے محرک کی ضرورت ہے اور چونکہ ذوات متحرکہ کا لامتناہی سلسلہ عقلاً محال

ہے اس لئے ایک ایسی ذات کا وجود ضروری ہے جو محرک تو ہو مگر خود متحرک نہ ہو۔

۶..... لہٰذا ایک محرکِ غیر متحرک کا وجود عقلاً ثابت ہو گیا۔ یہی خدا ہے۔

۷..... اس محرکِ غیر متحرک کے لئے ضروری ہے کہ وہ غیر طبعی طریقے سے دوسرے کو حرکت دے۔ اگر یہ سوال ہو کہ جو ذات خود، غیر قابل حرکت ہے اور اس میں حرکت نہیں ہے وہ دوسرے کو کیسے متحرک کر سکتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدا اسی طرح کائنات کو حرکت دیتا ہے جس طرح کوئی جمیل یا محبوب، شئی، دوسرے کو متحرک کر دیتی ہے مثلاً مصوّر یا فطرت کا شاہکار ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے حالانکہ وہ خود ساکن رہتا ہے۔ اسی طرح وہ نصب العین جسے ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں، خود متحرک ہوئے بغیر ہمیں متحرک کر دیتا ہے۔ بس اسی طرح "ازلی تصور" یہ ارسطو کی اصطلاح میں (واجب الذاتہٖ کا اصطلاحی نام ہے) خود متحرک ہوئے بغیر، مادے کو متحرک کرتا رہتا ہے۔

۸..... محرک اول (واجب لذاتہٖ یا خدا) فلکِ اول کو بلاواسطہ متحرک کرتا ہے۔ فلک اول میں محبت کا مادہ موجود ہے اس لئے اس میں نفس ناطقہ (SOUL) بھی لازمی موجود ہے۔ یعنی فلک اول ایک ذی حیات ہستی ہے۔

۹..... فلک اول کے علاوہ جس قدر افلاک اور سیارے ہیں انہیں عقول حرکت دیتی ہیں۔ یہ عقول، جو بقول ارسطو پچپن یا سینتالیس ہیں۔ سب کی سب قدیم بالزمان ہیں۔ اگرچہ حادث بالذات ہیں۔

۱۰..... محرکِ اول واجب الذاتہٖ، محض صورۃ (FORM) ہے۔ ہیولیٰ (مادے) سے پاک ہے محض فعلیت ہے۔ غیر مادّی ہے۔ اس میں نہ خواہش ہے نہ ارادہ ہے نہ احساس ہے بلکہ وہ محض ادراک ہے۔ اس میں کوئی طبیعی فعلیت نہیں ہے محض عقلی فعلیت ہے۔ وہ محض خیر ہے اور ازلی ہے وہ الحیّ ہے مگر مشخّص نہیں ہے۔ چونکہ کوئی شئے خدا سے اعلیٰ نہیں ہے اور اس کی فکر صرف اعلیٰ کا تصوّر کر سکتی ہے اس لئے وہ صرف اپنا تصوّر کر سکتا ہے یعنی کائنات کا تصوّر اس کے لئے محال ہے۔ خدا خود ہی اپنی فکر کا معروض ہے۔ چونکہ وہ اپنی ذات کے علاوہ کسی شئے کا تصوّر نہیں کر سکتا اس لئے کائنات کے حوادث اور واقعات سے بے تعلق ہے۔ انسان تو خدا سے محبت کر سکتا ہے مگر خدا کسی انسان سے محبت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اسے کسی شئے کی حاجت نہیں ہے۔ وہ فکر خالص ہے، کافی بالذات ہے۔ نہ

اس میں محبت ہے نہ نفرت، نہ ارادہ نہ کوئی آرزو، نہ اخلاقی صفات نہ کسی سے کوئی علاقہ۔ وہ اپنی فکر میں فکر کرتا رہتا ہے۔ اسی لئے وہ کائنات کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ وہ ہر شئے کا مقصود ہے مگر وہ ہر شئے سے بے تعلق ہے۔ بس وہ اپنی ذات ہی میں فکر کرتا رہتا ہے۔ خود ارسطو کے الفاظ ہیں۔ "اس کی فکر اپنی فکر میں فکر کرنا ہے دگر ہیچ" (مابعد باب ۱۲۔ فصل ۹)

خلاصہ ء کلام اینکہ ارسطو کا خدا ازلی ہے غیر متحرک ہے۔ غیر متغیر ہے، واجب ہے، کائنات سے جدا ہے، غیر مادی ہے، کل ہے، خیر محض ہے، اعلیٰ ہے، علۃ العلل ہے، ہر تغیّر کی علت ہے، سراسر فعلیت سب سے بے نیاز ہے۔

چونکہ وہ خیر محض ہے اس لئے اسے شر کا کوئی علم نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہو نہیں سکتا۔ علم کے علاوہ خدا میں کوئی فعلیت نہیں ہے اور علم بھی صرف اپنے علم کا علم ہے نہ کہ غیر (کائنات) کا۔ علّت تامّہ ہونے کی حیثیت سے خدا سے معلول (عقل فعّال) کا صدور ہوا۔ اسی صدور میں خدا مجبور ہے۔ وہ چاہے بھی تو اس صدور کو نہیں روک سکتا۔ یہی عقل فعال، صانعِ عالم ہے۔ (کتاب النفس)

۱۱۔ ارسطو اس کائنات کو ازلی (قدیم) مانتا ہے۔ نہ اس کا آغاز ہے نہ انجام۔ ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گی۔ مادہ اور روح (نفس ناطقہ) بھی ازلی ہیں (اسی لئے عالم قدیم ہے)۔

۱۲۔ مابعد الطبیعات میں ارسطو نے یہ کہا ہے کہ خدا اس کائنات سے جدا ہے اور بے تعلق ہے یعنی وراء الکائنات ہے مگر کتاب النفس (DE ANIMA) میں وہ خدا کو داخل کائنات قرار دیتا ہے۔ خدا ہر فرد میں جاری و ساری ہے۔

نوٹ..... ارسطو بھی افلاطون کی طرح اکثر مقامات میں مبہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے شارحین میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ الیگزینڈر کچھ کہتا ہے، ابن رشد کچھ فرماتے ہیں۔ طامس ایکوناس کچھ کہتا ہے، ڈاکٹر راس کچھ کہتا ہے۔ ۱۲

ارسطو کے تصور باری (واجب الذاتہ) پر تنقید

میں اس مختصر حاشئے میں ارسطو کے تصور واجب لذاتہ پر مفصل تنقید نہیں کر سکتا، صرف چند اشارات پر اکتفا کروں گا۔

۱۔ ارسطو کا یہ قول (نظریہ) کہ خدا صرف اپنی فکر میں فکر کرتا رہتا ہے، میرے نزدیک ہی نہیں، اکثر نقادان فلسفہ ارسطو کی رائے میں بڑا مضحکہ خیز ہے۔ اگر علامہ ابن ارشد آج زندہ ہوتے تو میں بڑے مؤدبانہ انداز میں ان سے پوچھتا کہ حضرت! کسی مفکر کے محض اپنی فکر میں فکر کرتے رہنے اور ایک فعل عبث میں کیا فرق ہے؟ اگر کوئی شخص ایسا فعل کرے جس کا کبھی کوئی ثمرہ یا نتیجہ مرتب نہ ہو تو ہم اسے حماقت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو ارسطو کے خدا کا یہ فعل "تفکر فی التفکر" حماقت کیوں نہیں ہے؟

کیا خدا کی شان ہے! مرشد رومیؒ اگر یہ فرمائیں کہ

آئینہ دل چوں شود صافی وپاک
نقش ہا بینی بروں از باد وخاک

تو پیروانِ ارسطو (معتزلہ) اسے خللِ دماغ سے تعبیر کریں۔ اور اگر ارسطو، واجب لذاتہٖ کو اس حماقت عظمیٰ کا مرتکب ٹھہرائے تو یہ حضرات اسے "معلمِ اول" کا خطاب عطا کریں۔

(۱)۔ کیا یہ بات قرینِ عقل ہے کہ خدا خود ہی علم کا موضوع بھی ہو اور خود ہی معروض بھی ہو؟

(۲)۔ کیا اس بات سے خدا کی کوئی عظمت ثابت ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی فکر (قوتِ مدرکہ یا متفکرہ) میں فکر کرتا رہتا ہے؟۔

(۳)۔ مانا کہ خدا کو اپنی ذات کا علم ہے مگر اس علم میں غور وفکر کرنے سے ہم کو یا کائنات کو کیا حاصل ہوا؟

(۴)۔ خدا کے اس بات میں فکر کرتے رہنے سے کہ میں فکر کر رہا ہوں نتیجہ کیا مرتب ہوا؟ یہ تو ایسا ہی ہے کوئی شخص پانی کو بلونا شروع کر دے!

(۵)۔ بلاشبہ ہم ایسے خدا کو جس کی فکر معروض صرف اس کی فکر ہو، اس آئینے سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو کسی دوسرے آئینے کے مقابل رکھا ہوا ہو۔ اگر دو آئینے بالمقابل رکھ دیئے جائیں تو کیا کوئی ثمرہ مرتب ہو سکتا ہے؟ کیا ان دونوں آئینوں کا وجود بیکار نہیں ہو گا؟

(۶)۔ جب خدا اس کائنات سے بے تعلق ہے بلکہ اسے نہ حوادث کا علم ہے نہ جزئیات

کا' نہ شر کا (اور ہر شخص جانتا ہے کہ یہاں یعنی اس عالم میں شر کا عنصر' خیر پر غالب ہے جتنی دیر میں ایک نیکی رونما ہوتی ہے اتنی دیر میں کم سے کم نو یا دس برائیاں ظہور پذیر ہو جاتی ہیں' جسے شک ہو صرف ایک دن 'اپنے شہر کے حالات وواقعات وحوادث کا استقصاء کر کے دیکھ لے تو سوال یہ ہے کہ ہمارے لئے ایسے خدا کا وجود اور عدم دونوں یکساں ہوئے یا نہیں؟ جب وہ ہم سے بے تعلق ہے تو ہم اس سے بے تعلق ہو جائیں گے۔ تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجتی آئی ہے۔

یہ اتنا زبردست اعتراض ہے کہ ارسطو کے تمام شارحین سخت مضطرب نظر آتے ہیں مگر بے دست وپا ہیں

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریّا می رود دیوار کج'

الگزنیڈر (اولین شارح ارسطو) نے اپنے آقا (استاد) کو اس اعتراض سے بچانے کے لئے انتہائی کوشش کی ہے مگر کامیابی نہیں ہو سکی کیونکہ ارسطو نے مشیئتِ ایزدی کی مطلق نفی کر دی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن رشد نے بھی اگرچہ یہ تسلیم کیا ہے کہ خدا اس کائنات کا خالق نہیں ہے اور نہ وہ فعّالٌ لِّما یرید ہے (کیونکہ اس سے عقل فعال کا صدور اس کی مرضی سے نہیں ہوا ہے لہٰذا وہ فاعل مختار ہستی نہیں ہے) تاہم عالم کلیات ہے تاکہ مشیتِ ایزدی کے لئے کسی حد تک گنجائش پیدا ہو سکے لیکن علاّمہ موصوف اور ان کی اتباع میں طامس ایکوئناس نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب "ایجادِ بندہ" کا مصداق ہے یعنی انہوں نے اپنی طرف سے اپنے استاد کی حمایت کی ہے۔خود ارسطو کی تصانیف سے ان شارحین کی تائید نہیں ہو سکتی۔

نوٹ۔ خدا کے فضل سے ارسطو کی تمام کی تمام تصانیف میرے پاس موجود ہیں اور مابعد الطبیعات کا اصلی یونانی متن بھی میرے پاس ہے جس پر ڈاکٹر راس (Ross) ——— نے مقدمے کے علاوہ حواشی بھی لکھے ہیں اور انگریزی میں دو ترجمے بھی میرے پاس ہیں۔ یہ وہی کتاب ہے جسے ابن سینا نے چالیس مرتبہ پڑھا تھا۔ ۱۲

۷۔ اگرچہ علامہ ابن رشد' طامس ایکوئناس اور ڈنس اسکوٹس نے ارسطو کو مشخّص خدا کا قائل کرنے کی کوشش کی ہے یعنی ایسا خدا جو انا کہہ سکے' انسانوں سے خطاب کر سکے'

پکار کا جواب دے سکے، محبت کر سکے وغیرہ مگر وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ارسطو کے یہاں خدا نہ خالق کائنات ہے اور نہ منتظم کائنات ہے وہ کائنات سے بالکل بے تعلق ہے۔ صرف اپنی فکر میں فکر کرتا رہتا ہے۔ یہی فکر فی الفکر اس کا وظیفہء حیات ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی فعلیت نہیں ہے۔

ارسطو نے مابعد الطبیعات کے علاوہ کتاب السیاست اور کتاب الاخلاق میں بھی اس بات کو واضح کیا ہے کہ خدا کی فعلیت صرف تفکّر ہے اسے اپنی ذات کا علم ہے اور وہ اس علم میں فکر کرتا رہتا ہے۔ خدا کا علم اپنی ذات کے علم میں محصور ہے۔ ارسطو نے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ اگر خدا، دنیا کے معاملات میں دلچسپی کا اظہار کرے تو یہ اظہار منافی کمال ذاتی ہو گا۔

۸۔ ارسطو کے نزدیک خدا خالق کائنات نہیں ہے۔ مادہ ازلی ہے اور حرکت بھی ازلی ہے۔ اس نے نظریہء تخلیق کے خلاف متعدد دلائل قائم کئے ہیں۔

یہ بات میں نے اس لئے لکھی ہے کہ یہاں میں ناظرین کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ ارسطو کے فلسفے اور مذہب اسلام کی بنیادی تعلیمات میں بُعد المشرقین ہے۔ اور معتزلہ کے زمانے سے لے کر عصر حاضر تک مذہب اور فلسفے میں تطبیق کی جس قدر کوششیں کی گئی ہیں وہ سب لاحاصل ہیں۔

مثلاً انیسویں صدی میں مغربی سائنس اور فلسفے سے مرعوب ہو کر ثناخوان دولت برطانیہ اور خیر خواہ تاج انگلینڈ سر سید احمد خان بہادر کے سی ایس آئی نے قرآنِ حکیم کی تفسیر لکھی لیکن اپنی انتہائی کوشش کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے کہ مذہب اور فلسفہ ہم آہنگ ہیں۔ اور عقل و نقل میں مطابقت پائی جاتی ہے۔ جب تک ایک مسلمان خدا کے خالق ہونے کا انکار نہ کرے وہ فلسفے اور مذہب میں تطبیق کی صورت پیدا کر ہی نہیں سکتا۔ جسے شک ہو کوشش کر کے دیکھ لے۔ راقم الحروم نے اپنی عمر عزیز کے چالیس سال اسی سعیٔ لاحاصل میں صرف کر دیئے۔

آخر میں میں اقبال کا ھمنوا ہو کر یہی کہنا پڑا۔

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم
دستِ رومیؒ پردۂ محمل گرفت

۹۔ ارسطو کے فلسفے میں عقول بھی غیر مخلوق ہستیاں ہیں اور ان کی تعداد ارسطو نے ایک جگہ ۴۷ لکھی ہیں دوسری جگہ ۵۵۔ اسی لئے رسل نے یہ لکھا ہے کہ "ارسطو نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ ان عقول کا خدا سے کیا علاقہ ہے؟ بلکہ ارسطو نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یہ عقول 'غیر متحرک محرک ہستیاں' ہیں یعنی یہ بھی خدا ہیں"۔

(دیکھو تاریخ فلسفہ مغرب مؤلفہ برٹرینڈ رسل صفحہ ۱۹۱)

۱۰۔ ارسطو کی طبیعات اور دوسری تصانیف کے مطالعے سے یہ بات واضح ہے کہ اس کو ساری دلچسپی طبیعات کے مسائل سے تھی۔ اس علم میں بنیادی مسئلہ "حرکت" ہے اس کو اس حرکت کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے ایک "محرک غیر متحرک" کا اثبات کرنا پڑا۔ اس کے فلسفیانہ نظام میں خدا کی ضرورت صرف اسی حیثیت سے ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ارسطو اپنی کوشش میں (حرکت کی توجیہہ میں) کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ وہ اس سوال کا کوئی معقول جواب نہ دے سکا کہ آرزو یا تمنا کی غیر جسمانی فعلیت 'فضا یا مکان میں حرکت کس طرح پیدا کر سکتی ہے؟ اس نے جو توجیہہ کی ہے وہ برہان عقلی نہیں ہے محض شاعری ہے اور میرا پچاس سالہ تجربہ یہی ہے کہ جب کوئی فلسفی کسی سوال یا عقلی اعتراض کا جواب نہیں دے سکتا تو وہ تشبیہ یا استعارہ' یا تمثیل یا مجاز یا قیاس یا ظن و تخمین کے دامن میں پناہ لے لیتا ہے اور اہل علم سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ یہ ساری چیزیں شاعری کا زیور ہیں یعنی اس کے لوازم ہیں۔

ہم ارسطو سے پوچھتے ہیں کہ خدا' جو اس کائنات سے قطعاً بے تعلق ہے، اسے کس طرح متحرک کرتا ہے؟ وہ اس کا جواب دیتا ہے کہ "جس طرح معشوق اپنے عاشق کو متحرک کرتا ہے"۔ ناظرین خود انصاف کریں کہ یہ برہان ہے یا شاعری؟ یہ جواب ہرگز تسلی بخش نہیں ہے۔ اور اگر معترض بھی شاعری کے "موڈ" میں آجائے تو کہہ سکتا ہے کہ اکثر عشاق تو معشوقہ کو دیکھ کر "ساکت' ہو جاتے ہیں' مطلق حرکت نہیں کرتے!! تو ارسطو کیا جواب دے گا؟

شیخ جلوہ دیکھ کر اس بت کا ساکت ہو گئے
ماسٹر صاحب بہت کمزور تھے چت ہو گئے

میری رائے یہ ہے کہ جو شخص روح اور مادے کو ازلی تسلیم کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حرکت کو بھی ازلی تسلیم کرتا ہے اسے خدا کے اقرار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اسی لئے جین دھرم، سانکھ درشن اور میک ٹیگرٹ نے خدا کا انکار کر دیا۔ ارسطو کے نظام فلسفہ میں خدا محض "برائے بیت" ہے۔ اسے نہ اس عالم سے کوئی علاقہ ہے اور نہ کسی انسان سے کوئی تعلق ہے۔ وہ اپنے ہی خیال میں مستغرق ہے۔ کائنات کا انتظام کرنے کے لئے عقول اور افلاک کافی ہیں۔

اسی لئے میں جین دھرم اور سانکھ درشن کو ارسطو کے فلسفے سے زیادہ معقول سمجھتا ہوں کیوں کہ ان دونوں کی تعلیم یہ ہے۔

(ا) جیو آتما (روح) اور پدگل (مادہ) دونوں انادی (ازلی) ہیں حرکت بھی ازلی ہے۔ اس لئے کسی خالق یا صانع کی ضرورت نہیں ہے۔

(ب) پرش اور پرکرتی دونوں انادی ہیں اس لئے کسی ایشور کی ضرورت نہیں ہے۔ عصر حاضر میں میک ٹیگرٹ بھی اسی لئے خدا کا منکر ہے۔

یہ اور بات ہے کہ ان فلسفوں پر متعدد عقلی اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں جن کی تصریح کا یہ موقع نہیں ہے مگر ان کا یہ کہنا ارسطو کے نظام کے مقابلے میں زیادہ معقول ہے کہ ہم خدا کے بغیر کائنات کی توجیہہ کر سکتے ہیں۔

الغرض ارسطو پر میرا بنیادی اعتراض ہی یہ ہے کہ جب روح اور مادہ اور حرکت تینوں قدیم ہیں تو پھر خدا کو تسلیم کرنے کی ضرورت کیا ہے؟

۱۱۔ ارسطو کا خدا، خدا پرستوں کی مطلق تسلی نہیں کر سکتا ؎

خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

جب وہ ہماری پکار کا جواب نہیں دے سکتا تو ہمیں اسے خدا تسلیم کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بالفاظ دیگر اگر ہم اس کے وجود کا انکار کر دیں تو ہمیں کیا نقصان ہو گا؟ ہمارا کیا بگڑ جائے گا؟ ہماری زندگی میں کیا کمی واقع ہو جائے گی۔

دیکھ لو! طامس ایکوناس نے ارسطو کے فلسفے کو 'رومن چرچ کی الٰہیات کی بنیاد بنانے کی غرض سے اس قدر تبدیل کر دیا کہ اگر ارسطو دوبارہ زندہ ہو جائے تو حیران رہ جائے گا! دراصل سب سے پہلے علامہ ابن رشد نے ارسطو کو مذہبی حلقوں میں مقبول بنانے کے لئے اس کے فلسفے کو حسبِ منشا خویش مفہوم عطا کیا' طامس نے اپنے حصولِ مقصد کے لئے ابن رشد کی پیروی کی۔

(تفصیل کیلئے دیکھو تاریخ نیچرل تھیالوجی مؤلفہ پروفیسر سی سی جے ویب صفحات ۲۳۳ تا ۲۹۱)

۱۲۔ ارسطو کا یہ محرکِ اول نہ خالق ہے نہ رازق ہے نہ حاکم ہے نہ مالک ہے نہ مجیب الدّعوات ہے نہ غفار الذنوب ہے نہ ہمارا حامی و مددگار نہ کریم کارساز ہے۔ اب محبت کا جذبہ (جو مذہب کی بنیاد ہے) تو خدا اس سے کوسوں دور ہے۔ کیونکہ اگر بقول ارسطو وہ کسی سے محبت کرنے لگے تو اس کے استغراق میں خلل واقع ہو جائے گا یعنی اس کی خدائی باطل ہو جائے گی۔

ارسطو کے تصور واجب لذاتہ پر مزید اعتراضات وارد کئے جا سکتے ہیں مگر میں بخوف طوالت قلم روکتا ہوں' لیکن جو کچھ لکھ دیا ہے اس سے حضرت حکیم صاحبؒ کے اس قول کی صداقت بخوبی آشکار ہو سکتی ہے۔ کیا خوب کہا ہے اکبرالہ آبادی نے ؎

عقل کو کچھ نہ ملا علم میں حیرت کے سوا
رنگ بھایا نہ کوئی دل کو محبت کے سوا

oooooooo

مؤلف: ڈاکٹر محمد رفیع الدین
مترجم: ڈاکٹر ابصار احمد

(۹)

منشورِ اسلام

جنّت کی نعمتیں اور دوزخ کے مصائب صرف استعارے نہیں ہیں

ہر شخص اگلی زندگی میں اپنی ذہنی سطح اور کیفیت کے مطابق اپنی جنّت اور دوزخ خود بنائے گا۔ اس سلسلے میں اصل اہمیت اس مادّی دنیا میں کمائے ہوئے اعمال کی ہوگی جس کے اثرات اس کے لاشعور میں جمع ہوتے رہتے ہیں اور جس کی پوٹلی باندھ کر وہ اگلی زندگی میں قدم رکھے گا۔ اس ابدی زندگی میں اسے اپنے کسب شدہ اعمال کے نتائج بھگتنے ہوں گے۔ یا تو مثبت طور پر وہ اس کے کام آئیں گے یا پھر سخت تکلیف دہ عواقب برداشت کرنا ہوں گے۔ وہاں پر اسے ان تمام لوگوں سے واسطہ پڑے گا جن کے حقوق اس نے اس دنیا میں غصب کیے ہوں گے۔ خود اس کے اعضا وجوارح کو زبان دے دی جائے گی جو اس کے خلاف شہادت پیش کریں گے۔ اگر دنیا میں اس کے اعمال اس کی فطرتِ سلیمہ اور خالقِ کائنات کی مرضیات کے مطابق ہوں گے تو اسے اگلی دنیا میں نہایت خوشگوار لوگوں کی معیّت اور نہایت دیدہ زیب اور دلفریب مناظر و اشیاء سے نوازا جائے گا۔ مثلاً باغات، مرغوب کھانے اور لذیذ مشروبات، خوبصورت ساتھی، نہریں اور سایہ دار ثمر اشجار وغیرہ۔ اس جنّت کی نعمتیں دنیا میں کمائے ہوئے اعمال اور اخلاقی جدّوجہد کے تناسب سے ہوں گی۔ کسی شخص نے جس درجے میں اپنے خالقِ حقیقی کی صفتِ حسن کو اپنے اخلاق و اعمال میں اپنایا ہوگا وہ اسی قدر نعمتوں کا مستحق ہوگا۔ اور آخرت کی زندگی میں بھی اس کی خودی کی بالیدگی اور ترفع کا عمل جاری رہے گا۔

اور اگر اس زندگی میں کسی شخص کے اعمال اس کی فطرتِ سلیمہ اور خالقِ کائنات کے احکام

کے خلاف ہوں گے تو اسے اپنے اعمالِ بد کو انتہائی کریہہ صورتوں میں متشکل دیکھنا پڑے گا مثلاً آگ کی لپٹ، انتہائی گندہ اور ناپسندیدہ پانی، ناکارہ اور بدذائقہ غذا، جسمانی تعذیب، سانپ بچھو وغیرہ۔ وہ ان سب سے بھاگنے کی کوشش کرے گا لیکن اس کا کچھ بس نہ چل سکے گا۔ اسے موت بھی آکر ان تکالیف سے چھٹکارا نہیں دلا سکے گی۔ چنانچہ جنت اور دوزخ اور ان کی تفاصیل صرف خالی استعارے نہیں بلکہ واقعی اور حقیقی مقامات ہیں جو اگرچہ متشکل ان اعمال کے نتیجے کے طور پر ہوں گے، جو ہم اس دنیوی زندگی میں کرتے ہیں اور جن کے اثرات ہمارے لاشعور میں جمع ہوتے رہتے ہیں یہی اعمال حیاتِ اُخروی میں معروضی کیفیات اور مقامات کا رُوپ دھار لیں گے جو یا تو انتہائی آرام دہ اور خوش کن ہوں گے یا انتہائی تکلیف دہ اور مضرت بخش۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ ایک مومن جس نے دنیا میں تھوڑے بہت نیک کام کیے ہوں گے وہ آخر کار جہنم سے اس کی گلوخلاصی کا باعث بنیں گے۔ اور اس طرح دوزخ کے مصائب سہتے ہوئے بھی اس کی روح کی بالیدگی کا سبب بالآخر وہ اعمال خیر بنیں گے جو اس نے دنیا میں کیے ہوں گے۔ اس نے صحیح نصب العین کے لیے جتنے زیادہ عمل کیے ہوں گے اتنی جلدی اسے جہنم کی آگ سے نجات ملے گی۔ اس طرح یہ اعمال وہ نور بن جائیں گے جو سیاہ کاریوں کے اندھیاروں کو ختم کر دیں گے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے:

اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ (ہود: ۱۱۴)

"بے شک نیکیاں گناہوں کو دُور کر دیتی ہیں"

غلط نصب العین سے محبّت کرنے والے کا انجامِ بد

جو شخص پیغمبروں کی ہدایات پر کان نہ دھرتے ہوئے کسی غلط نصب العین کو اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح پوری زندگی میں غلط روش پر چلتا ہے، وہ آخرت میں نہایت المناک انجام سے دوچار ہوگا۔ بالخصوص اگر حیاتِ دنیوی کے اختتام یعنی موت کے وقت بھی وہ غلط نظریات اور عمل پر کاربند ہے تو اس کی روح کی صحیح سمت میں ترقی و بالیدگی کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں۔ ارشادِ ربّانی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَکْبَرُوْا عَنْھَا لَا تُفَتَّحُ لَھُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ ؕ وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُجْرِمِیْنَ ۝

(الاعراف : ۴۰)

"یقیناً جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان کے مقابلے میں سرکشی کی اُن کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور نہ ہی وہ جنّت میں داخل ہوں گے یہاں تک کہ اُونٹ سوئی کے ناکے میں سے گزر جائے۔ اور ہم مجرموں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔"

وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (الحج : ۳۱)

اور جو اللہ کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہراتے تو (اس کا حال ایسا ہے کہ) جیسے وہ آسمان سے گر پڑا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ج (النساء : ۴۸)

اللہ یہ کبھی معاف نہیں کرے گا کہ اس کے ساتھ (کسی کو) شریک گردانا جائے۔ ہاں اس کے سوا (جتنے گناہ ہیں) وہ جس کو چاہے معاف کر دے۔

شرک ایسا گناہِ عظیم ہے جسے اللہ تعالیٰ کبھی نہیں بخشتا۔ ایک مشرک کے لیے یہ کبھی ممکن نہیں ہوتا کہ وہ دوزخ کے عذاب سے نجات حاصل کر سکے۔ چنانچہ اس کی روح ہمیشہ کے لیے اندھیاروں میں بھٹکتی ہے اور اسے نور یا روشنی کی کوئی رمق کبھی بھی حاصل نہیں ہوتی۔ وہ ابدالآباد تک اپنے اعمال سے کسب شدہ اندھیرے میں گھری رہتی ہے جس طرح وہ دنیوی زندگی میں اندھیرے اور حجاب میں رہی۔ اسی طرح آخرت میں بھی تیرہ شبی اس کا مقدر بنتی ہے :

وَمَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ سَبِیْلًا ۝ (بنی اسرائیل : ۷۲)

اور جو اِس (دنیا میں) اندھا بنا رہا تو وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور راہِ (نجات) سے بالکل بھٹکا ہوا۔

ایسے شخص نے اپنے تئیں خواہ کسی عمل کو کتنا ہی بھلا اور اچھا سمجھا ہو، یا اسے فلاحِ عام اور انسانیت دوست جذبے کے تحت انجام دیا ہو، حیاتِ اُخروی میں وہ (ایمان باللہ کے بغیر) کسی کام کا نہ ہوگا۔ چونکہ اس کا مطمحِ نظر یا نصب العین غلط تھا اس لیے یہ بظاہر اچھے کام بھی اسی غلط نصب العین کی مقصد براری کرتے ہوئے اس کے حقیقی روحانی ترفع میں بالکل ممد نہ ہونگے۔ چونکہ ان تمام افعال کے پس پردہ اللہ کی رضاجوئی کا جذبہ کارفرما نہ تھا اس لیے آخرت میں قطعاً نتیجہ خیز نہ ہوں گے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں متعدد بار ارشاد ہوتا ہے:

فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝ (الکہف: ۱۰۵)

سو ان کے اعمال اکارت گئے۔ پس ہم قیامت کے دن ان کے لیے ترازو کھڑی ہی نہیں کریں گے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ (النور: ۳۹)

اور جن لوگوں نے کُفر کی روش اختیار کی اُن کے اعمال تو دشتِ (بے آب) میں سراب کی مانند ہیں جسے پیاسا پانی سمجھ بیٹھتا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ (ابراہیم: ۱۸)

جن لوگوں نے اپنے رَبّ کے ساتھ کفر کی روش اختیار کی اُن کے اعمال کی مثال راکھ (کے ڈھیر) کی سی ہے جسے آندھی کے روز ہوا لے اڑے۔ جو کچھ انہوں نے (اپنے نیک اعمال کے ذریعے دنیا میں) کمایا ہے اس میں سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہ آئے گا۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ؕ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ (الکہف: ۱۰۳، ۱۰۴)

(اے پیغمبر ان سے) کہو کہ کیا ہم تمہیں ایسے لوگ بتائیں جو اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں ہیں؟ (یہ) وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی

گئیں اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت خوب کام کر رہے ہیں۔

مندرجہ بالا تشریحات سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جنّت کی نعمتوں اور دوزخ کے عذاب کا آغاز اسی دنیا میں ہو جاتا ہے۔ ایک صحیح العقیدہ اور نیکوکار مسلمان اسی دنیا میں اگلی زندگی میں ملنے والی جنّت کے مسرّت و آرام کا کچھ تجربہ حاصل کرنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک ایمان سے تہی دست شخص دنیوی زندگی ہی میں دوزخ کی تکالیف اور سوزش کا مزہ چکھنے لگتا ہے۔ لیکن چونکہ ایک بندۂ مومن دنیوی زندگی کے دوران اپنے نفس اور شیطان کے حملوں کے خلاف ہر وقت چوکس رہتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے رب کی نعمتوں کو پورے طور پر اُخروی زندگی ہی میں دیکھے گا۔ ایک کافر کی روش اس کے برعکس ہوتی ہے۔ وہ اپنے رویّے میں صحیح نصب العین اور اس کے تقاضوں کی قطعاً پرواہ نہیں کرتا، چنانچہ اس کا عمل تقوی اور اخلاقی حدود کو پامال کر دیتا ہے۔ اور دنیا کی عارضی لذتوں میں کھویا رہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک فرمان اسی حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے:

اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّۃُ الْکَافِرِ۔ (الحدیث)

دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنّت ہے۔

تحلیلی نفسیات کی مثبت شہادت

تحلیلی نفسیات دان بھی اس بات کے قائل ہیں کہ ہر انسانی عمل (بشمول خواہشات) ہمارے لاشعور کا مستقل حصّہ بن کر محفوظ ہو جاتا ہے۔ متعدد تحلیلی نفسیات دان اس امر کا مدلّل ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ ہر انسانی حرکت اور عمل کا ایک اثر اس کے ذہن اور خودی پر پڑتا ہے اور یہ ذہنی کیفیت اور اثر اس کے لاشعور میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا ہے۔ امتدادِ زمانہ سے ان اثرات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ان اثرات سے پتہ چلتا ہے کہ ذہنِ انسانی کا لاشعوری حصّہ بالکل مختلف اصولوں کے تحت علیحدہ وجود رکھتا ہے اس میں بیک وقت متضاد نشاناتِ عمل محفوظ ہو سکتے ہیں اور وہ منطقی قوانین کے مطابق ایک دوسرے کو ختم نہیں کرتے بلکہ متضاد اور باہم مخالف اثرات اس میں ایک ساتھ جمع ہو سکتے ہیں۔ اس حقیقت کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ شعوری زندگی کے بعض انتہائی غیر

اہم اور بھولے بسرے واقعات کے ارتسامات بھی اس لاشعور میں محفوظ رہتے ہیں۔ حالانکہ شعوری زندگی میں ان کے وقوع پذیر ہوتے ہوئے ہم نے انہیں قطعاً اہمیت نہیں دی ہوتی لیکن یہی واقعات ہمارے ذہن کے پردے پر آکر خوابوں کا علامتی رُوپ دھار لیتے ہیں۔ اس حقیقت کا مزید ثبوت ہپناٹزم کے عمل سے ملتا ہے جس میں ہپناٹزم کا ماہر اپنے معمول پر نیم خوابی کی سی کیفیت طاری کر کے اس کے لاشعور میں گہری اتری ہوئی یادوں کو شعور کے سطح پر لے آتا ہے اور سوالات کے ذریعے ان کا اظہار کرواتا ہے۔ فرائڈ رقم طراز ہے۔

"اِڈ، (لاشعور) میں تصوّرِ زماں کے متبادل کوئی خیال نہیں ہوتا اور وقت کے گزرنے کے سلسلے میں بھی اس میں کوئی تصوّر نہیں ہوتا۔ ذہنی کیفیات کے آنے جانے میں بھی زمانی تغیّر کا احساس و اِڈ، میں جگہ نہیں پاتا۔

یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو رہی ہے کہ ہم نے دبی ہوئی خواہشات کے لاشعور میں چلے جانے اور اس ضمن میں امتدادِ زمانہ کے غیر حقیقی ہونے کا بہت کم ادراک کیا ہے۔ میرا گمان یہ ہے کہ اس سے بہت سے حقائق کو سمجھنے کی کلید ہمارے ہاتھ آسکتی ہے۔ اگرچہ خود میں ابھی اس خیال کو مزید آگے نہیں بڑھا سکا ہوں۔"

ان علمی تصریحات کی روشنی میں یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ انسان کے وجود کے کسی حصّے میں (جس کا اسے شعور نہیں) اس کے تمام اعمال درج کیے جا رہے ہیں اور یہ ریکارڈ بالکل درست اور ہر دم خواہی نخواہی اس کے ساتھ رہتا ہے۔ انسان کے اعمال کے ہر لحظہ ریکارڈ کی طرف قرآن کریم کے ان الفاظ میں اشارہ ہے:

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ط (بنی اسرائیل: ۱۳)

اور ہم نے ہر انسان کا صحیفۂ عمل اس کے گلے میں لٹکا رکھا ہے۔

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (الانفطار: ۱۰-۱۲)

اور یقیناً تم پر (ہماری طرف سے) نگران مقرّر ہیں، معزّز لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔

ذہنِ انسانی کا لاشعوری حصّہ دراصل اس کی شخصیت یا خودی ہے۔ کیونکہ جسے ہم شعوری ذہن کہتے ہیں وہ لاشعوری ذہن کا صرف ایک چھوٹا سا حصّہ ہوتا ہے۔ انسان کے جسم اور ذہن کی ساخت اور مادّی اجزاء کی مسلسل تبدیلی کے باوجود اس کے لاشعور میں محفوظ اعمال کا ریکارڈ بغیر کسی کمی بیشی یا تبدیلی کے جاری رہتا ہے اور جیسا کہ ماہرِ نفسیات فرائڈ کا بھی خیال ہے یہ قدرت کا ایک نہایت اہم انتظام ہے۔ قرآن اسی حقیقت کے ضمن میں مندرجہ ذیل صراحتیں پیش کرتا ہے:

(ا) زمانی اور مکانی قوانین کا اطلاق صرف جسمِ انسانی پر ہوتا ہے۔ انسانی خودی (روح) جسم سے علیحدہ وجود رکھ سکتی ہے۔ صرف روح لافانی ہے۔

(ب) خودی کے حیاتِ دنیوی کے اعمال کے نتائج مسرت و خوشی یا تکالیف اور شدائد کی شکل میں اگلی زندگی میں نکلیں گے۔

(ج) اچھے یا بُرے نتائج کے ساتھ خودی کا استحکام یا ارتقاء حیات بعد الممات میں جاری رہے گا۔

قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات اس ضمن میں قابلِ غور ہیں۔

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ط
اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ (المجادلۃ : ۶)

اُس روز جب اللہ ان سب کو (جلا) اٹھائے گا، پھر انہیں جتلا دے گا جو کچھ وہ کرتے رہے۔ اللہ نے تو اسے (یعنی ان کے اعمال کو) شمار کر رکھا ہے اور وہ خود اسے بھول گئے ہیں۔ اور اللہ تو ہر چیز پر گواہ ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ
اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ (المومنون : ۱۱۵)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں (یونہی) بیکار پیدا کر دیا ہے اور یہ کہ تمہیں ہماری طرف لوٹ کر نہیں آنا ہے۔؟

وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ط وَلَا يَظْلِمُ
رَبُّكَ اَحَدًا ۝ (الکھف : ۴۹)

اور جو کچھ انہوں نے (دنیا میں) کیا تھا وہ سب (اپنے سامنے) موجود پائیں گے۔ اور تمہارا رب کسی پر (ذرا بھی) ظلم نہیں کرتا۔

انسانی وجود کے لاشعوری حصّے میں اس کے کیے ہوئے تمام اعمال (خواہ کوئی عمل کتنا ہی چھوٹا اور کتنا ہی چھپ کر کیا گیا ہو) کا محفوظ ریکارڈ قیامت کے دن اس کی نگاہوں کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ تاکہ وہ خود اس کو دیکھ لے اور اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے بفحوائے آیت قرآنیہ:

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ط (بنی اسرائیل: ۱۳)

اور ہم نے ہر انسان کا صحیفۂ عمل اس کے گلے میں لٹکا رکھا ہے۔

اس دن ہر شخص اپنے نامہ اعمال کو دیکھ کر اپنے انجام کو جاننے کے لیے کافی ہوگا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں بتایا گیا ہے:

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ط كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝ (بنی اسرائیل: ۱۴)

پڑھ اپنا اعمال نامہ، آج تو خود ہی اپنے خلاف حساب کرنے والا کافی ہے!

قیامت کے دن جب ہر شخص اپنا نامہ اعمال دیکھے گا تو یہ جان کر ششدر رہ جائے گا کہ دنیوی زندگی کے دوران کیا ہوا انتہائی چھوٹا عمل بھی اس میں درج ہے اور یہ کہ کوئی عمل بھی اس سے باہر نہیں رہا۔ چنانچہ عالمِ حیرت میں کفِ افسوس ملتا ہوا پکار اُٹھے گا:

مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ج (الکہف: ۴۹)

یہ کیسا نوشتہ ہے کہ اس نے نہ تو کسی چھوٹی چیز کو چھوڑا ہے اور نہ ہی بڑی چیز کو، مگر سب کو شمار کر لیا ہے۔

خواہ کوئی عمل کتنا ہی چھوٹا اور اس کی دانست میں بے وقعت کیوں نہ ہو، اس روز اس کی جواب دہی اسے کرنا ہوگی اور مکافاتِ عمل سے دوچار ہونا پڑے گا۔ بفحوائے آیتِ قرآنیہ:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزال: ۷، ۸)

تو جس نے ذرّہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اُسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ بھر بُرائی کی ہوگی تو وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔

حیاتِ اُخروی کی خواب کے تجربات سے مشابہت

حیاتِ اُخروی کے تجربات کی نیند کے دوران خواب میں دیکھے جانے والے مناظر اور تجربات سے ایک درجے کی مماثلت ہے۔ خواب کے دوران انسان کا وہ شعور جو تجربات سے گزرتا ہے، اس کے مادی جسم سے بالکل لاتعلق ہوتا ہے۔ انسان کا جسم نیند کی حالت میں بستر پر دراز آرام کر رہا ہوتا ہے جبکہ انسانی شعور کسی اور غیر مرئی جسم کو استعمال کرتے ہوئے خواب میں مختلف تجربات اور احساسات کو محسوس کرتا ہے۔ اور ان تجربات سے متعلقہ غمی، خوشی یا خوف کے جذبات بتمام و کمال محسوس کرتا ہے اور اشیاء اور انسانوں کو دیکھتا اور ان کا بھرپور تجربہ حاصل کرتا ہے۔

خواب کے تجربات کے دوران انسانی خودی اپنے مادّی حصّے یعنی جسم سے کلیتاً منقطع ہوتی ہے۔ اس کی بعینہٖ یہی حالت موت کے بعد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نیند کو موت سے مشابہ بیان کرتا ہے۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ (الزمر: ۴۲)

وہ اللہ ہی ہے جو ان کی موت کے وقت رُوحیں قبض کر لیتا ہے اور جو ابھی مرا نہیں اس کی رُوح نیند میں (قبض کر لیتا ہے)

فرق یہ ہے کہ خواب کے تجربات کا تعلّق اکثر و بیشتر ہمارے مستقبل سے ہوتا ہے جبکہ اُخروی زندگی ہمارے ماضی یعنی دنیوی کا عکس ہوگی۔ حیاتِ دنیوی کے جملہ تجربات و افعال جو ہمارے لاشعور میں محفوظ ہوتے رہتے ہیں، قیامت کے دن بالکل اسی طرح ہمارے

سامنے کھول کر رکھ دیئے جائیں گے جس طرح فلم کی ریل میں مناظر بند ہوتے ہیں اور اسے پروجیکٹر میں لگا کر بعد میں کسی وقت تمام مناظر کو پردہ سیمیں پر دیکھا جا سکتا ہے۔

حیاتِ دنیوی میں خودی کے ارتقاء کی اعلیٰ ترین سطح

جُوں جُوں ایک صاحبِ ایمان شخص کی صحیح نصب العین کے لیے محبّت بڑھتی ہے، اسی قدر اسے اطمینان اور مسرّت کا احساس زیادہ ہونے لگتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات عبادت یا مراقبے کے دوران اسے ایسی کیفیّت کا احساس ہوتا ہے کہ گویا وہ حسنِ ازل کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہے۔ اس کی صورت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے ایک لوہے کی سوئی مقناطیس کی طرف کشش رکھتی ہے۔ اس کشش میں بعض اوقات کششِ ثقل سے بھی زیادہ کھچاؤ ہوتا ہے۔ اس روحانی تجربے میں جو لذّت اور وجد کی کیفیّت محسوس کی جاتی ہے کوئی دوسرا تجربہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کیفیّت میں ایک سالک اپنے محبوب کا بلاواسطہ دیدار کرتا ہے اور اس کی خودی اس تجربے میں پُوری طرح محو ہوتی ہے۔ اس مقام پر وجودِ باری تعالیٰ کی معیّت کا احساس اس قدر پُرکیف ہوتا ہے کہ کوئی بھی اس کیفیّت سے نکلنا تکلیف دہ پاتا ہے لیکن حق تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول ہی کے لیے ایک صاحبِ ایمان اس روحانی تجربے سے باہر آ کر زیادہ ہمّت اور عزم کے ساتھ خلقِ خدا کو اس صراطِ مستقیم پر لگانے کی کوشش کرتا ہے جس کا حکم اسے ملا ہے۔ دینِ حق کی یہ دعوت اس کے صحیح نصب العین کے ساتھ محبّت کا ہمیشہ اہم جزو بنی رہتی ہے۔ مذکورہ بالا روحانی تجربے کے بعد ایک صاحبِ ایمان زیادہ شوق اور جذبے کے ساتھ دینِ حق کی سربلندی کی جدوجہد میں لگ جاتا ہے۔ اگرچہ یہ روحانی تجربہ بڑا مختصر ہوتا ہے لیکن ایک مردِ حق کو اس کا تجربہ مراقبے اور عبادت میں اکثر ہوتا رہتا ہے۔ اس تجربے کے اس کی آئندہ زندگی پر مندرجہ ذیل اثرات مرتب ہوتے ہیں:

(۱) اسے دِلی مسرّت و انبساط اور اطمینانِ قلب کی ایک کیفیّت حاصل رہتی ہے۔ گویا اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے وجود اور اس کائنات کا راز پا گیا ہے اور ان کی معنویّت اس پر عیاں ہو گئی ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ○ (الرّعد : ۲۸)

وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور ان کے دل اللہ کی یاد سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ یاد رکھو، اللہ کی یاد ہی سے دل اطمینان حاصل کرتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا (حم السجدۃ : ۳۰)

بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر (اس پر) جمے رہے اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں (یہ کہتے ہوئے کہ) نہ ڈرو اور نہ غم کھاؤ۔

(۲) اس میں ضبطِ نفس اور خود شعوری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو چھوٹے سے چھوٹے گناہ اور معصیت سے بھی بچاتا ہے۔ اس کی خود آگہی ترقی کی اعلیٰ ترین سطح پر پہنچ جاتی ہے۔

(۳) چونکہ اس کے ذہن و قلب میں خوف و شک کا کوئی شائبہ بھی نہیں رہتا اس لیے اس میں بے پناہ قوتِ عمل پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کمر کس لیتا ہے۔ اس کی شخصیت ایک متحرک اور فعال شخصیت بن جاتی ہے اور وہ پوری دنیا میں اللہ تعالیٰ کی مرضیات نافذ کرنے کی بھرپور جدّ و جہد کرتا ہے۔ اقامتِ دین کے عظیم کام کے لیے وہ اپنے آپ کو نفسیاتی، اخلاقی اور علمی طور پر تیار کرتا ہے اور اپنے کردار کو خوب مضبوط بناتا ہے۔ اور یہ تمام صفات وہ اپنے اعلیٰ روحانی تجربے اور پاکیزہ باطنی کیفیات کی وجہ سے ہی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

(۴) وہ ان اوامر و نواہی پر سختی سے کاربند رہتا ہے جن پر عمل کے ذریعے ہی وہ خود آگہی اور خدا شناسی کے اس بلند مقام تک پہنچتا ہے، جہاں وہ اس کی رُوحانی برکات سے متمتع ہوتا ہے۔ وہ حیاتِ دنیوی کے آخری دم تک تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کی اس روش پر قائم رہتا ہے۔

(۵) چونکہ اس کے مقاصدِ حیات اپنے خالقِ حقیقی کے مقاصد کے ساتھ مکمّل طور پر مطابقت

اختیار کر لیتے ہیں اس لیے اس کی مرضی اور ارادے میں حق تعالیٰ کی مشیت شامل ہو جاتی ہے۔ اس طرح اس کے اعضاء و جوارح سے وہی افعال انجام پاتے ہیں جو خالقِ حقیقی کو پسند ہوتے ہیں۔

خالقِ حقیقی کا بلاواسطہ مشاہدہ۔ (احسان)

کیا ذاتِ حق تعالیٰ کا بلاواسطہ مشاہدہ اور دیدار ممکن ہے؟

اس سوال کا جواب اس صورت میں زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے جب ہم اپنے اردگرد پھیلی ہوئی اشیاء کے ادراک و مشاہدے کے عمل کو سمجھ لیں۔ خارجی شے سے آنے والی روشنی کی شعاعیں جب ہماری آنکھ کے پردے پر پڑتی ہیں تو پتلی سے گزرنے کے بعد وہ اس شے کا عکس آنکھ میں بناتی ہیں۔ اس عکسی تصویر کی حس بصری شریانوں کے ذریعے ذہن تک پہنچائی جاتی ہے جہاں سے ہمارا شعور اس شے کا ادراک حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ بصارت کے عمل میں آخری اہم اور فعال عنصر ہماری خودی ہے اور مشاہدے کی اصل حقیقت خودی یا ذہنِ انسانی کا تصوراتی عمل ہے۔ اس تصوّر کے بعض اجزاء مثلاً رنگ اور وضع قطع کی صفات میں بعض اجزاء ذہن انسانی کی فعالیت کے زیرِ اثر شامل کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ شے مدرک دراصل خارج میں موجود شے نہیں ہوتی بلکہ متعدد شئون پر مشتمل تصوّر ہوتا ہے۔ ذہن، بصری شریان اور روشنی کا کام اس پورے عمل میں معاون کا ہوتا ہے جس سے شعور کو اس تصوّر کی جملہ صفات کا علم ہوتا ہے۔ جب ایک شعور کو یہ علم حاصل ہو جاتا ہے تو وہ ان واسطوں کے بغیر بھی اس تصوّر کو قائم کر سکتا ہے۔ شے کی صفات کا علم جتنا زیادہ اور واضح ہوگا بغیر حواس کا تصوّر بھی اتنا ہی زیادہ صاف اور واضح ہوگا۔

جب مسلسل اخلاقی پابندی اور مذہبی مراقبے سے ایک صاحبِ ایمان کی صحیح نصب العین کے لیے محبت انتہائی بڑھ جاتی ہے اور خالقِ حقیقی کی صفاتِ عالیہ کا تصوّر بہت واضح ہو جاتا ہے تو لمبا اوقات حالتِ مراقبہ میں اس پر ان صفات کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے شعور پر پورے طور پر چھا جاتی ہیں۔ اس قلبی کیفیت میں وہ اپنے خالقِ حقیقی کو بالکل اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح دنیا میں موجود کسی شے کو دیکھا جاتا ہے۔ یہ روحانی تجربہ الفاظ کی گرفت میں نہیں آ سکتا

اور بالخصوص ان لوگوں کے لیے اس کی تفہیم بہت مشکل ہوتی ہے جنہیں خود اس تجربے سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔

ایک صاحبِ ایمان کی روحانی ترقی کی اس منزل کو جس پر اسے عرفانِ حق حاصل ہوتا ہے احسان کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اسی کا حوالہ ان الفاظ میں آیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

بے شک اللہ محسنین سے محبت کرتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احسان کی تعریف اس طرح کی ہے:

اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ (الحدیث)

احسان یہ ہے کہ تُو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تُو اسے دیکھ رہا ہے۔

محبتِ خداوندی جتنی زیادہ گہری ہوتی ہے اسی قدر حقیقتِ مطلقہ کا مشاہدہ زیادہ واضح ہوتا ہے اور روحانی سرور بھی اسی تناسب سے حاصل ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ انہیں پہلے باری تعالیٰ کا بلاواسطہ مشاہدہ کرایا جائے تاکہ بعد میں وہ اس نبی پر ایمان لائیں حالانکہ یہ صرف حکم عدولی اور ایمان نہ لانے کا ایک بہانہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایمان اور اطاعت کی سخت مشقتوں سے گزر کر ہی انسان اس قابل ہوتا ہے کہ اسے حق تعالیٰ کا بلاواسطہ مشاہدہ حاصل ہو۔ چنانچہ انہیں اپنے نامعقول مطالبے کی سزا بھگتنی پڑی۔

جاری ہے

عَنْ عُثْمَانَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهُ

(۲)

معاشیاتِ اسلام

مولانا محمد طاسین

ربوٰا اور مضاربت میں فرق

اب میں حسب وعدہ اس بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام نے معاملہ ربوٰ کو کیوں حرام و ناجائز اور معاملۂ مضاربت کو کیوں حلال و جائز ٹھہرایا ہے اس کا اصل فلسفہ کیا ہے؟

اس کی توضیح و تفصیل کے سلسلہ میں پہلی اور بنیادی بات جو ذہن نشین ہونا ضروری ہے یہ کہ اسلام میں معاشی حق کا تصور کیا ہے، یعنی یہ کہ اسلام میں کوئی شخص کس بنا پر کسی شے کا حقدار قرار پاتا ہے، کیونکہ جب تک معاشی حق کا وہ تصور متعین اور واضح طور پر سامنے نہ ہو جو اسلام کے نزدیک ہے معاشی عدل اور معاشی ظلم کا مطلب سمجھ میں نہیں آ سکتا جسے اسلام نے معاشی معاملات کے جواز و عدمِ جواز اور حلال و حرام کے تعین میں سامنے رکھا ہے اس لئے کہ عدل کی تعریف میں حق رسی اور ظلم کی تعریف میں حق تلفی جزو لاینفک اور ایک لازمی حصہ ہے، سامنے رکھنے کا مطلب یہ کہ جو معاشی معاملات اپنی حقیقت و ماہیت کے لحاظ سے عدل کے مطابق تھے ان کو اسلام نے جائز ٹھہرایا اور جو معاملات معاشی ظلم و حق تلفی پر مبنی تھے ان کو اس نے حرام اور ناجائز قرار دیا ہے۔

قرآن و حدیث کے مطالعے اور غور و فکر سے معاشی حق اور معاشی عدل و ظلم کے متعلق جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ کہ دنیا میں انسان کے لئے جو نفع بخش مادی اشیاء ہیں وہ دو طرح کی ہیں، ایک وہ جو اب تک اپنی قدرتی حالت و شکل پر قائم و

برقرار ہیں' دوسری وہ جن کی انسانی تصرف سے قدرتی حالت و شکل بدل چکی اور اب وہ انسانوں کے درمیان خاص قدر و قیمت کی حامل ہیں' اول الذکر اشیاء کے متعلق اسلام کا اصول یہ ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے انتفاع و استفادہ کے لئے عام ہیں ہر انسان ان کی قدرتی افادیت سے یکساں طور پر متمتع و مستفید ہو سکتا ہے ان میں سے کسی شے کے متعلق کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ خاص طور پر میری ہے اور مجھے ہی اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے' البتہ جب کوئی شخص دوسروں سے پہل و سبقت کر کے ایسی اشیاء میں سے کسی شے کو اپنے تصرف میں لاتا اور دماغی و جسمانی سعی و محنت سے اس کے اندر ایسا ردوبدل کرتا ہے کہ اس شے میں قدرتی افادیت کے ساتھ ایک نئی افادیت پیدا ہو جاتی اور معاشرے میں اس کی ایک قدر و قیمت قائم ہوتی ہے تو یہ شے اس شخص کے استفادہ کے لئے مخصوص ہو جاتی اور اس کا حق قرار پاتی ہے جس کو حقِ ملکیت بھی کہا جاتا ہے اور اس حق کی بنیاد دراصل وہ سعی و محنت ہوتی ہے جس سے اس شے کی قدرتی حالت و شکل میں تغیّر و تبدل کے ذریعے ایک نئی افادیت اور قدر و قیمت وجود میں آئی' بالفاظ دیگر اس حق کی بنیاد قابل مشاہدہ وہ محسوس اثرات ہوتے ہیں جو کسی انسان کی سعی و محنت سے وجود میں آکر مختلف تغیرات و تبدلات کی شکل میں قدرتی اشیاء کے ساتھ قائم ہو جاتے ہیں چنانچہ جس قدرتی شے کے ساتھ کسی انسان کی سعی و محنت کے مفید اثرات قائم ہوں وہ شے اس انسان کے فائدہ کے لئے مخصوص ہو جاتی ہے اس کی دلیل یہ کہ قرآن مجید میں یہ اعلان ہے کہ ہر انسان کی سعی و محنت کے مفید اثرات اسی کے فائدہ کے لئے مخصوص ہیں وہی ان سے فائدہ اٹھانے کا حقدار ہے دوسرا کوئی اس کی اجازت کے بغیر ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا' مثال کے طور پر سورۃ النجم کی آیت ہے وَ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی اور یہ کہ نہیں ہے انسان کے لئے مگر وہ جو اس کی سعی سے وجود میں آیا۔

اس آیت سے بہر حال یہ مفہوم نکلتا ہے کہ ہر انسان کی سعی و محنت کے مفید اثرات اسی کے ہیں اور وہی ان کا مالک اور حق دار ہے دوسرا کوئی ان کا مالک و حق دار نہیں لہٰذا اس کی رضامندانہ اجازت کے بغیر دوسرا کوئی ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

قرآن مجید کا یہ تصور کہ ہر انسان کی سعی و محنت کے مفید اثرات اس کے لئے مخصوص ہیں انسانی فطرت، عقل و قیاس اور عدل و انصاف کے عین مطابق ہے، غور سے دیکھا جائے تو ایک انسان اپنے اختیار و ارادے سے جو بھی سعی و عمل کرتا ہے وہ صرف اس وقت کرتا ہے جب وہ اپنی دانست میں یہ سمجھتا ہے کہ اس سے اس کو کوئی دنیوی یا اخروی فائدہ پہنچے گا، دراصل فائدے کا شعور ہی وہ محرک ہوتا ہے جو اس کو اس سعی و عمل پر آمادہ کرتا ہے یہ فائدہ مادّی بھی ہوتا ہے اور روحانی بھی، وہ بظاہر جو کام و عمل دوسروں کے لئے کرتا ہے اس کی تہہ میں بھی یہ محرک کارفرما ہوتا ہے کہ اس سے مثلاً مجھے اللہ کی رضا و خوشنودی، یا لوگوں میں شہرت و عزت یا قلبی سکون و اطمینان کی نعمت حاصل ہوگی، یہ دراصل انسانی فطرت ہے جسے کبھی بدلا نہیں جا سکتا، پھر جب یہ واقعہ ہے کہ انسان اپنے اختیار و ارادے اور علم و شعور سے جو اچھا اور مفید کام و عمل کرتا ہے اپنی ذات کے فائدہ کے لئے کرتا ہے تو عقل و دانش اور عدل و انصاف کا بھی یہی تقاضہ ہے کہ اس کام و عمل کے مفید اثرات اس کے لئے مخصوص ہوں اس لئے بھی کہ کام و عمل کے کرنے میں جس نے تکلیف اٹھائی اور اپنی انرجی و توانائی صرف کی ہے وہی اس کے مفید اثرات کا بطور جزاء مستحق بھی ہو سکتا ہے پھر چونکہ یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انسانی سعی و عمل کے اثرات اپنا الگ تھلگ کوئی وجود نہیں رکھتے بلکہ وہ مختلف تغیرات و تبدلات اور گوناگوں شکلوں سے مادّی اشیاء کے ساتھ قائم و وابستہ ہوتے ہیں لہٰذا ہر انسان کے کام و عمل کے مفید اثرات کا اس کے لئے مخصوص ہونے کا

عملی طور پر مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ قدرتی شے اس کے لئے مخصوص ہو جس کے ساتھ اس کے مفید کام و عمل کے نفع بخش اثرات قائم و وابستہ ہو گئے ہوں، قرآن مجید کے اس اصولی تصوّر کی بعض جزوی تفصیلات احادیثِ نبویہ میں بیان فرمائی گئی ہیں ایک حدیث نبویؐ کے کلمات اس طرح ہیں :۔

"مَنْ اَحْیَا اَرْضًا مَیْتَۃً فَھِیَ لَہٗ" جس نے کسی مردہ یعنی بنجر و بے کار پڑی زمین کو زندہ یعنی آباد کیا اور قابلِ کاشت بنایا وہ اس کے استفادہ کے لئے مخصوص ہو گئی اب اس کی اجازت کے بغیر دوسرا کوئی اس میں مالکانہ تصرف نہیں کر سکتا ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص کسی خطہ زمین کو آباد کرتا اور قابلِ کاشت بناتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی سعی و محنت کے اثرات قائم ہوتے اور سب کو نظر آتے ہیں، دراصل یہی اثرات وہ سبب ہیں جس کی بنا پر اس شخص کو زمین کے اس ٹکڑا سے انتفاع و استفادے کے حق میں دوسروں پر ترجیح و تخصیص حاصل ہو جاتی ہے جسے حقِ ملکیت کہا جاتا ہے۔ مختصر خلاصہ یہ کہ جو منفعت بخش مادّی شے اپنی قدرتی حالت پر برقرار ہو اس کے متعلق کسی انسان کے حق کی بنیاد اسلام کی رو سے وہ مفید اثرات و تغیرات ہیں جو اس انسان کی سعی و محنت سے پیدا ہو کر اس قدرتی شے کے ساتھ قائم اور وابستہ ہو گئے ہوں چنانچہ جب تک وہ اثرات قائم رہتے حق قائم رہتا اور جب وہ زائل اور ختم ہو جاتے حق بھی ختم ہو جاتا ہے۔

اور دوسری قسم کی اشیاء جو پہلے سے ضرور کسی نہ کسی کی ملکیت میں ہوتی اور ان سے استفادے کا حق لازماً کسی نہ کسی شخص کے لئے مخصوص ہوتا ہے اور لوگ مختلف ضرورتوں اور مصلحتوں کے تحت آپس میں ان کا تبادلہ اور لین دین بھی ضرور کرتے ہیں ایسی اشیاء کے متعلق اسلام کا اصول یہ ہے کہ ان میں سے کوئی شے ایک شخص کے حق ملکیت سے نکل کر دوسرے کے حقِ ملکیت میں اس وقت داخل اور منتقل ہوتی اور دوسرا اس وقت اس کا حقدار بنتا ہے جب پہلے شخص کو اس

کی شے کا ایسا عوض پیش کر دیا جائے جو افادیت ' مالیت اور قدر و قیمت میں اس شے کے برابر و مساوی ہو ' بالفاظ دیگر تجارتی لین دین میں ایک شخص دوسرے کی شے کا اس وقت مستحق قرار پاتا ہے جب اس کی طرف سے دوسرے کے لئے قدر و قیمت کے لحاظ سے ویسی ہی شے موجود ہو ' دیکھا جائے تو اسلام کا یہ اصول بھی انسانی فطرت اور عدل و انصاف کے عین مطابق ہے کیونکہ ہر انسان فطرۃً یہ چاہتا ہے کہ اسے اس کی مملوکہ شے کا کسی نہ کسی شکل میں ضرور معاوضہ ملے خواہ وہ مادّی و دنیوی معاوضہ ہو یا روحانی و اخروی معاوضہ ' اسی طرح انسانی مساوات و عدل کا بھی یہی تقاضا ہے کہ ہر انسان کو اس کی چیز کا ضرور اور پورا معاوضہ ملے جو اس کا فطری حق ہے اور در اصل مالی لین دین کے معاملہ میں فریقین کی حقیقی رضامندی کا معروضی معیار بھی یہی معاوضہ ہے۔ چنانچہ اسلام نے اپنے اسی مذکورہ اصول کی بنا پر مالی لین دین کی ایسی شکلوں کو جائز و مشروع ٹھہرایا جن میں ہر فریق کے لئے اس کے مال کا عوض اور بدل موجود تھا اور اس کی وجہ سے فریقین کی حقیقی رضامندی پائی جاتی تھی ' اور اس کے بر خلاف ان شکلوں کو ناجائز و ممنوع قرار دیا جن میں ایک فریق کے لئے اس کے مال کا مادّی یا روحانی عوض اور بدل موجود نہ تھا ' مثلاً اسلام نے بیع و شراء کے طریقہ کو جائز اور مشروع ٹھہرایا جس میں ہر فریق کے لئے اس کی چیز کا عوض موجود ہوتا ہے ایک کے لئے کسی جنس یا سامان کی شکل میں اور دوسرے کے لئے بطور قیمت زر و نقدی وغیرہ کی شکل میں ' اجارے کے معاملہ کو جائز ٹھہرایا جس میں اجیر اور مستاجر دونوں کے لئے اس کی چیز کا معاوضہ موجود ہوتا ہے ایک کے لئے خدمت اور محنت کے نفع بخش اثرات کی شکل میں اور دوسرے کے لئے نقدی وغیرہ کی شکل میں ' قرض کے طریقہ کو جائز و مشروع ٹھہرایا جس میں قرض دار کے لئے قرض کا مال ہوتا اور قرض خواہ کے لئے وقتِ مقرر کے بعد اس مال کی مثل ہوتی ہے ' صدقے ' ہبے ہدیئے کے طریقہ کو جائز ٹھہرایا جس میں اگرچہ دینے والے

کے لئے مالی اور مادّی معاوضہ موجود نہیں ہوتا لیکن اس کے علم و اعتقاد کے مطابق اخروی اجر و ثواب اور دنیوی شہرت و عزت کی شکل میں روحانی اور معنوی معاوضہ ضرور موجود ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ رضا و خوشی کے ساتھ اپنی چیز دوسرے کو دے دیتا ہے' دوسرے کا مال لینے کے جن طریقوں کو اسلام نے ناجائز و ممنوع ٹھہرایا ان میں سرقہ' غصب' خیانت' رشوت' قمار اور ربٰو کا واضح طور پر ذکر ہے ان سب طریقوں میں ایک شخص دوسرے کا جو مال لیتا ہے بغیر عوض اور بلا بدل کے لیتا ہے لہٰذا ان میں دوسرے کی رضامندی موجود نہیں ہوتی جس کے بغیر دوسرے کا مال لینا جائز اور حلال نہیں ٹھہرتا' حدیث نبویؐ ہے " لایحل مال امرء مسلم الا بطیب نفسه " ترجمہ "کسی مسلم کا مال دوسرے کے لئے حلال و جائز نہیں مگر یہ کہ وہ طیب خاطر اور قلبی رضا و خوشی سے اس کو دے "۔

قرآن مجید کی جس آیت میں ایک دوسرے کا مال بلا عوض اور بغیر رضامندی لینے کی واضح اور قطعی ممانعت ہے وہ سورۃ النساء کی یہ آیت ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ترجمہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل و ناحق طریقوں سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ وہ ایسی تجارت کے ذریعے ہو جس میں فریقین کی رضامندی پائی جاتی ہو۔ اس آیت قرآنی میں جو لفظ باطل ذکر ہوا ہے وہ حق کی ضد ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا ترجمہ ناحق سے کیا جاتا ہے بعض مفسرین کرامؒ نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے باطل کی تعریف کے متعلق حضرت عبدؓ اللہ بن عباسؓ اور حضرت حسن بصریؒ کا یہ قول نقل کیا ہے " الباطل هو كل مایوخذ من الانسان بغیر عوض " ترجمہ باطل وہ ہے جو کسی انسان سے بغیر عوض لیا جائے۔

علامہ رشید رضا نے تفسیر المنارؒ میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے باطل کے متعلق لکھا ہے " اما الباطل مالم یکن فی مقابله شئی حقیقی " پس باطل وہ

مال ہے جو کسی حقیقی شے کے بالمقابل نہ ہو اور چونکہ از روئے عدل کسی مال کا صحیح عوض اور بدل وہ ہوتا ہے جو افادیت، مالیت اور قدر و قیمت میں اس مال کے برابر ہو لہٰذا آیتِ مذکورہ کے پہلے حصے کا مطلب ہوا اے مسلمانوں تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ایسے عوض و بدل کے بغیر نہ لو جو مالیت اور قدر و قیمت میں لئے ہوئے مال کے مساوی و برابر ہو ورنہ ایسا لینا باطل اور ناحق ہو گا۔ اور چونکہ سرقہ، غصب، خیانت، رشوت، جوئے اور ربٰو میں ایک فریق دوسرے کا مال بغیر عوض و بدل کے لیتا ہے لہٰذا اس آیت کی رو سے وہ سب باطل اور ممنوع قرار پاتے ہیں، پھر آیت کے دوسرے حصہ میں لفظ اِلّا کے بعد مالی لین دین کے اس طریقے کا بیان ہے جو باطل نہیں حق ہے اور وہ طریقہ ایسی تجارت اور بیع و شراء کا طریقہ ہے جس میں فریقین کی حقیقی رضامندی پائی جاتی ہو کیونکہ جہاں تک ظاہری اور زبانی رضامندی کا تعلق ہے وہ تو معاملہ ربٰو میں بھی موجود ہوتی ہے لیکن وہ قلبی اور حقیقی رضامندی نہیں ہوتی بلکہ مجبوری کے تحت ظاہری ہوتی ہے اس کا ثبوت یہ کہ جس کے پاس حسب ضرورت اپنا مال ہو وہ کسی سے قرض نہیں لیتا، اسی طرح جس ضرورت مند کو قرضِ حسنہ مل سکتا ہو وہ کبھی سود پر قرض نہیں لیتا سود پر تو قرض بادلِ نخواستہ اور مجبوراً ہی لیا جاتا ہے، دراصل حقیقی رضامندی کا معروضی معیار وہ مساوی عوض و بدل ہے جو دینے والے کو اپنی چیز کے مقابلہ میں ملتا ہے، جہاں تک معاملۂ تجارت کا تعلق ہے جس میں دو فریقوں کے مابین خرید و فروخت ہوتی ہے ظاہر ہے کہ اس کے اندر ہر فریق کو اس کی چیز کا عوض و بدل ملتا ہے ایک کو یعنی خریدار کو کسی جنس یا ساز و سامان کی شکل میں اور دوسرے کو ثمن یعنی نقدی وغیرہ کی شکل میں، البتہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ دکاندار، خریدار کی کسی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بازار کے عام نرخ سے زیادہ داموں چیز خریدار پر فروخت کر دیتا اور وہ اسے بادل نخواستہ مجبوراً لے لیتا ہے یا اس کے برعکس بعض دفعہ دکاندار اپنی کسی

ضرورت کے تحت مجبور ہوتا ہے کہ بازار کے عام نرخ سے کم پر اپنی چیز فروخت کر دے لہٰذا گاہک اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کم قیمت پر چیز خرید لیتا اور دکاندار بادل نخواستہ اس کو دے دیتا ہے' ایسی دونوں صورتوں میں معاملہ کے ایک فریق کی حقیقی رضامندی موجود نہیں ہوتی صرف ظاہری موجود ہوتی ہے لہٰذا آیتِ مذکورہ کے دوسرے حصہ کی رو سے یہ معاملہ درست نہیں ٹھہرتا کیونکہ اس میں ایک فریق کو اس کا پورا حق نہیں ملتا بلکہ ناقص وادھورا ملتا ہے جو عدل کے خلاف ہے' قرآن مجید کی متعدد آیات میں فرمایا گیا ہے کہ خرید وفروخت میں ماپ تول عدل کے مطابق ٹھیک ٹھیک اور پورا پورا ہونا چاہئے اور اس میں ذرہ برابر کمی بیشی نہ کی جائے اور فرمایا لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دی جائیں کیونکہ بخس و کمی سے حق تلفی ہوتی ہے۔ اس سے معاملہ عدل کی بجائے ظلم کا رنگ اختیار کر لیتا اور ناجائز ہو جاتا ہے۔

مختصر خلاصہ یہ کہ لین دین کے مالی معاملات میں اسلام کے نزدیک جس بنا پر ایک شخص دوسرے کی چیز کا حق دار قرار پاتا ہے وہ ہے لینے والے کی طرف سے قدر وقیمت کے لحاظ سے مساوی عوض وبدل اور دینے والے کی جانب سے حقیقی رضا مندی جو آپس میں لازم وملزوم ہیں چنانچہ جس معاملے میں یہ چیز موجود نہ ہو وہ معاملہ باطل ٹھہرتا ہے۔ چونکہ معاملہ ربو میں یہ چیز موجود نہیں ہوتی' یعنی یہ کہ اس میں مُقرِض اپنے مقروض سے قرض کے اصل مال پر جو بھی زائد مال لیتا ہے اس کے عوض اس کی طرف سے کوئی مال موجود نہیں ہوتا لہٰذا وہ اس زائد مال کا حق دار نہیں ٹھہرتا اور چنانچہ جو لیتا ہے ناحق لیتا اور دوسرے کی حق تلفی کا مرتکب ہوتا ہے جسے قرآن حکیم نے اپنی آیت لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ○ میں معاشی ظلم سے تعبیر کیا ہے' مطلب یہ کہ اصل مال پر زائد لے کر نہ تم اپنے مقروض پر ظلم کرو اور نہ وہ تمہارے اصل مال میں کمی کر کے تم پر ظلم کرے' ظلم حرام ہے لہٰذا جو معاملہ ظلم پر مبنی ہو وہ بھی لازماً حرام ہے' واضح رہے کہ ربو کے حرام ہونے کی

جو وجہ میں نے عرض کی ہے یہ میری طبع زاد نہیں بلکہ یہ وہی وجہ ہے جو صدیوں پہلے بہت سے مفسرین قرآن نے آیات ربٰو کی تفسیر میں بیان فرمائی ہے چند حوالے عرض کئے جاتے ہیں ملاحظہ فرمایئے! علامہ جصاص حنفیؒ اپنی فقہی تفسیر "احکام القرآنؒ" میں تحریر فرماتے ہیں " ان تلک الزیادۃ المشروطۃ انما کانت رباً فی المال العین لانہ لا عوض لھا من جھۃ المقرض " مقرض کے حقیقی مال میں یہ مشروط زیادتی ربٰو ہے کیونکہ مقرض یعنی قرض دینے والے کی طرف سے اس زیادتی کا کوئی عوض نہیں ہوتا۔ (۲) علامہ ابو بکر بن العربی مالکیؒ اپنی تفسیر احکام القرآن میں لکھتے ہیں " المراد بالربٰو فی الآیۃ کل زیادۃ لا یقابلھا عوض " اس آیت میں ربٰو سے مراد ہر وہ مال میں زیادتی ہے جس کے مقابل عوض نہ ہو۔ علامہ ابو البرکات عبداللہ بن احمد النسفی ، اپنی تفسیر مدارک التنزیل میں رقمطراز ہیں " الربا ھو فضل مال خال عن العوض فی معاوضتہ مال بمال " مال سے مال کے معاوضہ میں جو فاضل مال عوض سے خالی ہو ربٰو ہے۔ علامہ آلوسیؒ اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں " الربٰو فی الشرع عبارۃ عن فضل مال لا یقابلہ عوض فی معاوضتہ مال بمال " شریعت میں ربٰو کا مطلب ہے مال سے مال کے معاوضہ میں وہ زائد مال جس کے مقابلہ میں عوض موجود نہ ہو۔ امام فخرالدین الرازیؒ کی تفسیر کبیر میں عبارت ہے " الربٰو یقتضی اخذ مال الانسان من غیر عوض " ربٰو کی فطرت میں یہ اقتضاء ہے کہ کسی انسان کا مال بغیر عوض کے لیا جائے۔ (جاری ہے)

❀❀❀

عام طور پر ہمارے یہاں

توحید علمی ونظری یعنی — **توحید فی العقیدہ**

پر تو بہت زور دیا جاتا ہے، لیکن

توحیدِ عملی

پر کما حقہٗ توجّہ نہیں دیجاتی

ڈاکٹر اسرار احمد

پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ زمر تا سورۂ شوریٰ پر تدبّر کے دوران

توحیدِ عملی کے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں

یعنی: اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین کی فرضیّت

کو خوب منکشف بھی فرمایا اور بیان کی توفیق بھی مرحمت فرمائی، اور

شیخ جمیل الرحمٰن کی محنت نے ان خطابات کو کتابی صورت دیدی

سائز ۱۸ × ۲۲/۸ ○ صفحات ۱۹۲ ○ عمدہ سفید کاغذ ○ دیدہ زیب کور

ھدیہ: ۱۵ روپے، علاوہ محصول ڈاک

مکتبہ انجمن خدّام القرآن : ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن ○ لاہور ۱۴

اراکینِ انجمن کے لئے

لطف الرحمٰن خان

قرآن کالج

آئندہ سال داخلوں کے لیے مناسب تشہیر کی ضرورت!

ربِّ کریم کی رحمت اور اسی کی نصرت وہدایت کے طفیل قرآن کالج میں تعلیم وتعلّم کا سلسلہ تسلّی بخش انداز میں جاری ہے۔ ہر حمد وستائش فقط ذاتِ باری تعالیٰ کو ہی زیب دیتی ہے اور ہم اسی کے حضور اپنا ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں۔

گذشتہ دنوں انجمن کے صدر مؤسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ساتھ ایک خصوصی نشست میں کالج کے تمام طلبہ نے اساتذہ کی کاوشوں اور کالج کے تعلیمی معیار پر مکمل اطمینان کا اظہار کیا۔ کچھ طلباء نے تأسف کے انداز میں شکایت کی کہ قرآن کالج کی مناسب تشہیر نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے طلباء اس خیر سے محروم رہ گئے ہیں۔ انہوں نے محترم ڈاکٹر صاحب سے پرزور درخواست کی کہ آئندہ سال کے داخلہ کے لئے مناسب تشہیر کر کے قرآن کالج کو لوگوں سے پوری طرح متعارف کرایا جائے۔

اراکین کے علم میں یہ بات ہو گی کہ گذشتہ سال تمام اہم اخباروں کے کل پاکستان ایڈیشن میں متعدد بار قرآن کالج کے اشتہار دیئے گئے تھے اور اس ضمن میں انجمن نے اچھی خاصی رقم صرف کی تھی اور ظاہر ہے کہ انجمن کے محدود وسائل اس سے زیادہ اخباری تشہیر کی اجازت نہیں دے سکتے۔ تاہم دو مرتبہ تمام اخبارات میں اشتہار دے کر مناسب حد تک تشہیر کر دی گئی تھی۔ اس کے باوجود کالج کے تعارف کے سلسلہ میں تشنگی کا احساس ایک اہم حقیقت کی غمّازی کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کالج میں داخلہ کی ابتداء اور اس کی آخری تاریخ کے اعلان کے لئے تو اخباری اشتہار مفید ہوتے ہیں لیکن ان کے ذریعے کالج کا بھرپور تعارف ممکن نہیں ہے۔ یہ کام تو نجی نشستوں میں انفرادی سطح پر ہی بطریقِ احسن انجام دیا جا سکتا ہے۔

یہی وہ کام ہے جس کے لئے تمام اراکین انجمن پر اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ابھی سے ہم میں سے ہر شخص اپنی نجی نشستوں میں قرآن کالج کو مناسب انداز میں متعارف کرانا شروع کر دے اور لوگوں کو اس منصوبہ کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلائے۔ ان کے سوالات کے جوابات دے اور شکوک و شبہات کو دور کرے۔ اس سلسلہ میں جس قدر معلومات درکار ہوں وہ بلا تکلف ہم سے طلب کریں۔ اگر کوئی تجویز ہو تو اس کے لئے ہم ممنون ہوں گے

اسی سلسلہ میں ہم اراکین کے علم میں یہ بات لانا چاہتے ہیں کہ قرآن کالج میں طلبہ کے ماہانہ ٹسٹ اور ماہانہ جائزے کا ایک بہت عمدہ نظام اپنایا گیا ہے۔ ماہانہ جائزہ کی ایک کاپی طلباء کے والدین کو براہِ راست بھیج دی جاتی ہے اور دوسری کاپی طلبہ کو دے دی جاتی ہے۔ ماہِ نومبر کے جائزوں کے جواب میں کچھ والدین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اس طریقِ کار کو بہت سراہا ہے۔ ایک طالب علم کے والد کے تأثرات بطور نمونہ ہم اراکین کی معلومات کے لئے شائع کر رہے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ انجمن کا ہر رکن قرآن کالج کے تعارف میں اپنا بھرپور کردار ادا کرے گا تاکہ آئندہ تعلیمی سال کے داخلہ کے وقت زیادہ سے زیادہ طلباء اس کالج سے مستفید ہو سکیں۔

السعی منا والاتمام من اللہ

جناب انچارج قرآن کالج۔ السلام علیکم!

یاد آوری کا شکریہ۔ سید ایوب احمد، طالب علم بی۔اے (سال اوّل) کی جائزہ رپورٹ برائے ماہِ نومبر گذشتہ ہفتہ موصول ہوئی۔ اس ماہانہ جائزہ کے مندرجات سے آپ کے ادارہ اور اساتذہ کی کاوشوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کی اور ان تمام مقتدر حضرات کی جنہوں نے اس ادارہ کو پروان چڑھایا ہے آرزوؤں اور امنگوں کی تکمیل فرمائے اور تمام طلباء کو اپنی آئندہ زندگی میں اس ادارہ کا نام روشن کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

آپ کا خادم
سید محمد مختار علی کراچی۔

تعارف و تبصرہ

نام کتاب : احکامِ ستر و حجاب　　مصنف : عبدالرحمٰن کیلانی

صفحات : ۸۸　　طبع : اوّل　　قیمت : ۹ روپے

ناشر : مکتبۃ السلام، سٹریٹ ۲۰، وسن پورہ، لاہور

تبرّج اور فحاشی کو انسانی معاشرے کی " مہلک بیماریوں میں سرِفہرست شمار کیا جا سکتا ہے۔ ہر مٹنے والی تہذیب اور برباد ہونے والی قوم کے آخری دنوں کی تاریخ اس حقیقت پر شاہدِ عادل ہے۔ آج کی مغربی تہذیب اسی بیماری کا شکار ہو چکی ہے۔ اور اپنی بہت سی خوبیوں اور " ترقیوں " کے باوجود اسی بیماری کی وجہ سے اپنا معاشرتی سکون کھو چکی ہے۔ بلکہ شاید موت کی وادی کے قریب پہنچ چکی ہے۔ اور ان کے اہلِ فکر و نظر کو اس خرابی اور خطرے کا احساس بھی ہے جس کی کچھ جھلک زیرِ تبصرہ کتابچہ میں بھی ہے۔

بدقسمتی سے بہت سی ترقی پذیر نو آزاد (سابق محکومِ مغرب) قوموں اور ملکوں نے مغرب سے یہ بیماری ورثہ میں پائی ہے۔ اور تباہی کے اس مسلّمہ تاریخی عمل کو " برضا و رغبت بلا جبر و اکراہ " مگر " بغیر سلامتی ہوش و حواس " ـــــ اختیار کر دیا ہے۔

اس دوڑ میں دنیا کے پاکیزہ ترین دین یعنی اسلام کے نام لیوا بھی شامل ہو گئے ہیں۔ حالانکہ دینِ اسلام نے اس مسئلہ پر کوئی خاموشی اختیار نہیں کی۔ بلکہ فحاشی اور تبرّج سے " حفظ ماتقدّم " اور " سدِّباب ذریعہ " کے طور پر بھی بہت سے احکام دیئے ہیں۔ ان میں سے ستر و حجاب کے احکام سرِفہرست ہیں اور اگرچہ ان احکام کی جہت نمائی اور ان میں مضمر حکمتوں اور ان کے مقاصد کے بارے میں امت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ تاہم ان احکام کی اطلاقی اور تطبیقی تفصیلات میں تاویل کے اختلاف کا دور صحابہؓ تک پتہ چلتا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتابچہ میں اس موضوع پر مختلف مواقف، ہر ایک کے دلائل اور جواب دلائل پر بہت کچھ بلکہ تقریباً تمام مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ جس کا مطالعہ بہرحال فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ اور یوں تو بحث مباحثہ میں کوئی دلیل سب کے لئے یکساں مسکت نہیں ہوا کرتی۔ وکان الانسان

اکثر شیٔ جدلاً

کتابچہ میں ستر و حجاب میں فرق کو اچھی طرح سمجھا یا گیا ہے۔ مؤلف ابتدا میں تو متشدّدانہ نقطۂ نظر کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے شام کے مشہور سلفی عالم ناصر الدین البانی کو بھی ان کے لچک دار رویہ پر ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ بلکہ البانی صاحب کا ایک کتابچہ ہی زیرِ تبصرہ کتابچے کی تالیف کا باعث بنا ہے۔ تاہم کتاب کے آخری حصّے میں احوال و ظروف اور استثنائی احکام کی بحث کے بعد انہوں نے "اعتدال کی راہ" (ص۸۰) کی طرف بھی رہنمائی کر دی ہے اور احکام و قانون کی جکڑ بندیوں کے بجائے "مقصدِ حجاب" کو رہنما اصول قرار دیا ہے (ص۷۹)

کتابچہ کے آخر میں اہلِ زیغ اور "مریضانِ قلب" کے اعتراضات بلکہ مغالطوں پر بھی مختصر مگر جامع تبصرہ موجود ہے۔ جسے مؤلف نے "مستشرقین" کے اعتراضات کا عنوان دیا ہے۔ دراصل یہ مستغربین کے اعتراضات ہیں۔ یعنی اہلِ مغرب بلکہ تہذیبِ مغرب کی چمک دمک سے متاثر اور مائل بہ بغاوت ذہن۔

کتابچہ میں بعض جگہ دلائل میں منطقی تسلسل نہیں ہے۔ (مثلاً ص۲۴ اور پھر ص۲۹ سے شروع ہونے والی بحث میں تقدیم و تاخیر ہو گئی ہے)۔ بعض جگہ تکرار بھی ہے (ص۱۷، ص۳۹) بعض جگہ تضادات بھی ہیں (ص۷۲، ص۸۰) کتابچہ میں املا کی اغلاط بھی خاصی زیادہ ہیں۔ خصوصاً عربی عبارات میں۔ اور کتابچہ کا انجام یعنی خاتمہ بھی بالکل اچانک (ص۸۹ پر) ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شاید کتاب ابھی جاری ہے یا آخر سے کچھ اوراق حذف ہو گئے ہیں۔

کتابچے میں (خصوصاً پہلے باب میں) بعض ایسی باتیں بھی درج ہیں جو کتاب کی سنجیدگی کے خلاف ہیں بلکہ بعض چیزیں تو "خام فکر" اور "اعجوبہ پسندی کی جبلّت" کے لئے غذا کا کام دینے والی ہیں۔ مزے کی بات ہے کہ "جنسی دنیا کے یہ عجائبات" زیادہ تر مودودی صاحب مرحوم کی کتاب "پردہ" سے ہی (بحوالہ) لئے گئے ہیں۔

بہرحال مجموعی طور پر کتابچہ میں مفید مواد زیادہ ہے اور اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں ہے۔

نام کتاب : خدا کہاں ہے ؟ مرتب : منشی عبدالرحمٰن خان

قیمت : -/۲۱ روپے

ملنے کا پتہ : ادارہ اشاعت علوم اسلامیہ چوک، ملتان شہر

اللہ تعالےٰ ساری کائنات کے خالق و مالک ہیں، ان کی نوع بنوع مخلوقات میں انسان اشرف المخلوقات ہے لیکن انسانوں کا ہی ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جو اس کی ذات پاک کے وجود کا منکر ہے، دہریت و الحاد کا شکار ہے۔ اس قسم کے لوگ زیادہ تر وہ ہیں جنہیں سائنسی دنیا میں بڑے بڑے تیر مارنے کا شرف حاصل ہے۔ اور وہ آسمان سے تارے توڑنے کے مدعی ہیں اور بہت کچھ کے دعوے دار لیکن نہیں سمجھ آتا تو یہ مسئلہ کہ ہم کس کے بندے ہیں؟

یہ کتاب جو ملتان کے متحرک اور فعال و سرگرم انسان منشی عبدالرحمٰن خان کے سلسلہ خزینہ بصیرت کی پہلی جلد ہے۔ ۲۶۵ صفحات پر مشتمل اور خوبصورت ڈسٹ کور سے مزین ہے۔ طباعت، کتابت اچھی ہے اور سب سے بڑھ کر اس کی معنویت کا سوال ہے کہ اس میں وہ نگارشات اکٹھی کی گئی ہیں جن سے معرفت ربانی کا دروازہ کھلتا اور عرفان حق کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ اس میں نقل و روایت کا سلسلہ کم ہے عقل و درایت کا سلسلہ زیادہ، کیونکہ بنیادی طور پر اس کے مخاطب وہ عزیزان عصر ہیں جنہیں سائنسی اکتشافات نے الجھنوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔

تشکیک کا شکار حضرات انشاء اللہ تعالےٰ اس سے بہت ہی روشنی حاصل کریں گے اور اسلام و سائنس کی خود ساختہ لڑائی کی طرح ڈالنے والے بھی سمجھ سکیں گے کہ مسلمان سائنس کے دشمن نہیں اور یہ کہ وہ عقل کے پیچھے لٹھ لے کر کبھی نہیں پڑے اور یہ کہ اگر سائنس پر روحانیت کی چھاپ لگا دی جائے اور اسے روحانیت کا تابع رکھا جائے تو اس سے انسانیت کی زیادہ مفید خدمت ہو سکتی ہے۔

●●●

بسم الله الرحمٰن الرحیم

معهد القرآن العظيم

قرآن إكاديمى

مَعهَدُ القُرآنِ شمسٌ بازِغَه　　فَهِيَ للظلماتِ كانَت دامِغَه
ظُلمةِ الإلحادِ دَيجُورِ الفُسُوق　　دُجنَةِ الرَّمسِ البَهِيمِ السَّابِغَه
غَيهَبِ الإشرَاكِ بِاللهِ الوَحِيد　　دُجيَةِ البِدعِ الحِداثِ السَّائِغَه
غيهمِ الجهلِ انزَوٰى مِن نورها　　فَانجَلَت مِنها القُلوبُ الزَّائِغَه
شَمسُ لاهورٍ إذن فاقَت ذُكا　　عَمَّ كُلاًّ، إذ هُداها البالِغَه
أُسَّهُ الدَّكتُورُ إسرارُ الكَرِيم　　فَهُوَ حَقًّا فِي الأناسي نابِغَه
هَدَفُهُ تَفهِيمَ قُرآنٍ مجيد　　مَن أَضَلَّتهُ النُّفوسُ الماضِغَه
دَرسُهُ القُرآنَ فِي العَصرِ الحَدِيث　　إِنَّهُ يُحيِي القُلوبَ الفارِغَه
لَوعَةٌ فِي قلبِهِ لِلمُسلِمِين　　زَهَّدَتهُ فِي الحَياةِ الرَّافِغَه
لَم أُبالِغْ إِن أَقُل هٰذا منار　　يَجنُبُ السَّارِي الطَّرِيقَ الرَّائِغَه
أَمَّهُ اللُّدَّغاءُ مِن فَجٍّ عَمِيق　　حَيثُ ذا تِرياقُ سَمِّ اللَّادِغَه
لا أَرَى الرَّحمٰنُ ذِي الشَّمسِ الأُفُول　　يالَها لَيلاً نَّهاراً بازِغَه

استاذ الحديث والعربية ولايت البرماوى - عفا الله عنه وعن والديه، آمين
معهدِ قرآن كريم (قرآن اكيڈمى)، ماڈل ٹاؤن لاہور۔

بعثتِ انبیاء و رسل کا اساسی مقصد ——— اور
بعثتِ محمدی کی تمامی و تکمیلی شان ——— نیز
انقلابِ نبوی کا اساسی منہاج ———

ایسے اہم موضوعات پر

ڈاکٹر اسرار احمد

کی

حد درجہ جامع تصنیف

نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

کا مطالعہ کیجیے

اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ طباعت ○ قیمت فی نسخہ ۴ روپے

مرکزی انجمن خدام القرآن ○ ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن ◎ لاہور